تنظیمِ اسلامی

نومبر ۲۰۰۷ء

ماہنامہ

# میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

# عرض احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

## سوات کا مسئلہ

### ہمارے حکمرانوں کے لیے لمحۂ فکریہ

پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں وادیٔ سوات اپنے بلند و بالا پہاڑوں' سرسبز وادیوں' پھلوں کے باغات' ندی نالوں اور چشموں پر مشتمل خوبصورت لینڈ سکیپ اور اللہ کی خلاقی و صناعی کے دیدہ زیب مناظر کے حوالے سے ایک امتیازی مقام رکھتی ہے اور بالعموم ایک مثالی سیر گاہ کے حوالے سے جانی پہچانی جاتی ہے ـــــ یہ علاقہ جو کبھی قدیم بدھ تہذیب کا ایک اہم مرکز تھا' آج نفاذِ شریعت کے حوالے سے بھی ملک گیر شہرت رکھتا ہے۔ وادیٔ سوات سے متصل دیر کا علاقہ چند سال قبل صوفی محمد صاحب کی نفاذِ شریعت تحریک کا مرکز تھا' لیکن اس تحریک کے زیادہ اثرات وادیٔ سوات اور مالاکنڈ کے بعض علاقوں میں نمایاں نظر آتے تھے۔ آج کل صوفی محمد صاحب کے داماد مولوی فضل اللہ نے نفاذِ شریعت کے حوالے سے اسی علاقے کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہوا ہے اور نفاذِ شریعت کے حوالے سے حکومتی رٹ کو چیلنج کرتے ہوئے اس حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے جو اسلام کو مٹانے کے امریکی ایجنڈے پر خلوص کے ساتھ عمل پیرا ہے۔ جس کے جواب میں حکومت بے رحمانہ انداز میں طاقت کا مظاہرہ کرنے پر تلی ہوئی ہے اور گن شپ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے پوری پوری بستیوں کو ملیا میٹ کرنے سے بھی دریغ نہیں کر رہی۔ طاقت کا یہ وحشیانہ استعمال ہمارے نزدیک نہایت قابل مذمت ہے۔

ہمارے نزدیک سوات میں جو کچھ ہوا وہ نائن الیون کے بعد حکومت کی غلط حکمت عملی' وزیرستان میں فوجی کارروائی اور لال مسجد کے معاملے کو غلط طریقے سے ہینڈل کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ بات اب کوئی راز نہیں ہے کہ اپنے ہی وفادار عوام کے خلاف فوجی کارروائیوں کا یہ سلسلہ صرف اور صرف امریکہ کے دباؤ پر اور اُسے راضی رکھنے کے لیے کیا جا رہا ہے جو ملک کو خانہ جنگی کی طرف لے جا رہا ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ دونوں طرف کلمہ گو ہیں۔ مسلمان فوجیوں کے ہاتھوں اپنے مسلمان بھائیوں کو مروایا جا رہا ہے جو نہایت شرم ناک ہے۔ ۱۹۷۱ء

میں مشرقی پاکستان میں قوت کا استعمال ملک کے دولخت ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ سوات کے معاملے کو طاقت سے دبانے کا نتیجہ کیا نکلے گا یہ سوچ کر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مولانا فضل اللہ اور ان کے ساتھی اس ملک کے شہری ہیں' وہاں کے لوگ ان کے اقدامات کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کی اگرچہ کلی تائید نہیں کی جا سکتی لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ سب کچھ دراصل وزیرستان میں حکومت کے ناروا فوجی ایکشن اور لال مسجد میں طلبہ و طالبات کے سفاکانہ قتل عام کا ردّعمل ہے جس کی اصل ذمہ داری موجودہ حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اُن کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے کہ علاقے میں شریعت کا نفاذ ہونا چاہیے۔ اس سے قبل صوفی محمد صاحب کے زمانے میں حکومت نے وہاں نفاذِ شریعت کا وعدہ کیا تھا' لیکن پھر اس وعدے کو پورا نہیں کیا گیا' جس کا ردّعمل موجودہ صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ لہٰذا حکومت کو یہ معاملہ طاقت کے بجائے احسن طریقے سے حل کرنا چاہیے۔ ہم اربابِ اقتدار سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سوات میں فوری طور پر فوجی کارروائی روک کر دوسرے معروف طریقوں مثلاً مذاکرات کے ذریعے اس معاملے کو فوری طور پر حل کرنے کی کوشش کریں اور اس کے اصل اور دیرپا حل کے طور پر نہ صرف ان کے اس جائز مطالبے کو پورا کرنے کا اہتمام کرے بلکہ پورے ملک میں شریعت الٰہی کو نافذ اور اللہ کے دین کو قائم و غالب کر کے اپنی اس دینی ذمہ داری کو پورا کریں جو ہر مسلمان حکمران کا اوّلین فریضہ ہے۔ اللّٰھم وفقھم لھٰذا۔

۞ ۞ ۞

## تذکرہ و تبصرہ

# استحکامِ پاکستان کی واحد اساس
# اور
# مغربی یلغار کا اصل ہدف

مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا خطابِ عیدالفطر

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

رمضان المبارک کی ابھی جو ستائیسویں شب گزری ہے اس میں قمری حساب سے پاکستان کی عمر کے ۶۲ برس پورے ہو گئے ہیں۔ شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے اگست میں ۶۰ سال ہوئے تھے' لیکن اصل میں ہمارا یومِ آزادی قمری حساب سے ہونا چاہیے۔ چونکہ ہماری سوچ کے اوپر مغربی تصورات حاوی ہیں' لہٰذا ہمارے ہاں قمری کیلنڈر کی طرف لوگوں کا بہت کم دھیان ہے۔ ان ۶۲ سال کے دوران ایسے وقفے بہت ہی مختصر آئے ہیں جبکہ یہ محسوس ہوا کہ پاکستان مستحکم ہے' اس کے اندر مقاومت موجود ہے اور یہ حالات کا مقابلہ کرنے کی کچھ صلاحیت رکھتا ہے' ورنہ زیادہ تر وقت یہ جہاز ڈولتا ہی رہا ہے۔ بہت پرانی بات یاد دلاتا ہوں کہ خان عبدالولی خان مرحوم نے دھمکی دی تھی کہ ہم طورخم پر لگی زنجیر کو وہاں سے ہٹا کر مارگلہ پر لا کر لگا دیں گے' یعنی صوبہ سرحد پاکستان سے علیٰحدہ ہو جائے گا۔ بہت کم ممالک ایسے ہوتے ہیں کہ جہاں کوئی اہم سیاسی لیڈر ایسے

بیان دے، لیکن ہمارے ہاں آئے دن یہ باتیں سننے کو ملتی ہیں کہ پتا نہیں پاکستان قائم رہے گا یا نہیں! ہمیشہ سے بہت ہی غیر یقینی کیفیت طاری رہی۔ اس سال ۹ مارچ سے جو صورت حال ہوئی ہے، ہر دن ایک سوالیہ نشان کھڑا ہوتا ہے کہ معلوم نہیں آج کیا ہو جائے اور کیسی صورتِ حال پیش آ جائے! شاید مارشل لاء لگ جائے۔ اب بے نظیر آ رہی ہیں۔ حکومت کی طرف سے انہیں اپنی آمد مؤخر کرنے کا کہا گیا ہے لیکن نظر یہ آ رہا ہے کہ اب وہ رکنے والی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اگر وہ اب رک جاتی ہیں تو ان کا سیاسی کیریئر ختم ہو جائے گا۔ جو کچھ بھی ہوگا، وہ آئیں گی۔ اِدھر سے یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر آئیں تو ہوسکتا ہے کہ تکلیف میں مبتلا ہو جائیں۔ واللہ اعلم اس سے کیا مراد ہے! دوسری جانب صدارتی الیکشن کا نتیجہ بھی معلق ہے، اس کی ابھی کوئی تنفیذ نہیں ہوسکتی۔ عدالتوں میں petitions کے انبار لگ گئے ہیں، جن پر وہ کام کر رہی ہیں۔ مارشل لاء کی تلوار ان کے سر پر لٹکی ہوئی ہے۔ اگر کوئی ایسا فیصلہ آ گیا جو جنرل مشرف کی پلاننگ اور امنگوں کے خلاف ہوا تو مارشل لاء آ سکتا ہے۔ یہ بات مرکزی وزیر بھی کھل کر کہہ رہے ہیں۔ اس ساری صورت حال کا ایک عمومی سبب ہے، جس کی طرف بدقسمتی سے بہت کم توجہ دلائی گئی۔ دراصل ہمارے بیشتر دانش وراور کالم نویس حضرات جمہوریت ہی کا رونا روتے رہتے ہیں جبکہ اصل بنیاد کی طرف غور نہیں کرتے۔

پاکستان ایک عام ملک نہیں ہے۔ یہ اسلام کے نام پر بنا تھا اور بڑی عظیم قوتوں کی مخالفت کے باوجود بنا تھا۔ گاندھی جیسا لیڈر، کانگریس جیسی عظیم جماعت اور برطانوی حکومت، سب کے سب پاکستان کے شدید مخالف تھے۔ گاندھی نے کہا تھا کہ میری لاش کے اوپر ہی پاکستان بن سکتا ہے۔ پاکستان کیوں بنا؟ اس لیے کہ ہم نے رو رو کر، گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں کی تھیں کہ انگریز کے جانے کے بعد ہمیں ہندوؤں کی غلامی سے بچا لے۔ ہمیں آزاد ملک دے دے تاکہ ہم اس میں تیرے دین کا بول بالا کریں، تیرے نبی ﷺ کا نظام قائم کریں۔ اس بنیاد پر پاکستان بنا تھا، جو کہ ایک معجزہ تھا۔ اس موضوع پر میری ایک کتاب ''استحکامِ پاکستان'' موجود ہے، جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ پاکستان

کا قیام کسی حساب کتاب میں نہیں آتا۔ کون سے اصول ہیں پولیٹکل سائنس یا سوشیالوجی کے جن کے تحت پاکستان بن گیا؟ سمجھ میں آنے والی بات بالکل نہیں ہے۔ پھر یہ کہ قیامِ پاکستان سے ایک سال پہلے قائداعظم نے مطالبۂ پاکستان سے دست برداری اختیار کر لی تھی۔ کیبنٹ مشن پلان میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اس وقت تو یہ ملک ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہوگا' جس کی ایک مرکزی حکومت اور تین زون ہوں گے' پھر دس سال کے بعد ان میں سے اگر کوئی علیٰحدہ ہونا چاہے تو ہو جائے۔ قائداعظم نے اسے مان لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں نظر آ رہا تھا کہ انگریز برصغیر سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ ان خفیہ سرکاری کاغذات (confidential papers) سے جنہیں ۳۰ سال کے بعد عام کر دیا جاتا ہے' یہ بات اب کھل کر سامنے آ چکی ہے کہ اس کام کے لیے ۱۹۴۸ء کا سال طے بھی کر دیا گیا تھا۔ لیکن پھر بہار میں فسادات ہو گئے' جن میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ راجستھان میں شُدھی کی زبردست تحریک چلی' جس میں بے شمار مسلمانوں کو ہندو بنا لیا گیا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ماؤنٹ بیٹن کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ ہمیں جلد ہی یہاں سے جانا ہوگا۔ چنانچہ اس موقع پر قائداعظم نے یہ سوچا کہ اگر ہم نے اپنے پاؤں زیادہ رگڑے تو شاید انگریز یک طرفہ طور پر کانگریس کو انتقالِ اقتدار کر دے اور یہاں سے چلتا بنے۔ پھر شیر کے منہ سے نوالہ نکالنا ممکن نہیں ہوگا۔ لہٰذا جیسا بھی ہے کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لو کہ دس سال کے بعد ہی سہی' پاکستان بننے کا امکان تو موجود ہے۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ اس نے نہرو کی زبان سے ایک جملہ نکلوا دیا۔ جب نہرو سے پوچھا گیا کہ کیا دس سال کے بعد علیٰحدہ ہونے کی اجازت ہوگی؟ تو اس نے کہا: ایک دفعہ ملک بن جانے دو' پھر کون کسی کو علیٰحدہ ہونے دیتا ہے! اس پر قائداعظم نے ریورس گیئر لگایا کہ اگر یہی ارادے ہیں تو پھر ہم نہیں مانتے۔ چنانچہ پاکستان بن گیا' بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ستائیسویں شب میں پاکستان نازل ہوا۔

یہ ملک صرف اسلام کی بنیاد پر مستحکم ہو سکتا تھا جبکہ اسی سے ہم نے رُوگردانی کی۔ ہم نے اللہ کے بجائے دوسرے سہارے ڈھونڈے۔ ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے' جب میں

اسلامی جمعیت طلبہ کا ناظم اعلیٰ تھا۔ اُس وقت اینٹی قادیانی موومنٹ کی وجہ سے حالات بڑے خراب تھے اور ہمارے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں طلبہ کا وفد لے کر ان سے ملنے گیا۔ اس زمانے میں ایک تجویز تھی کہ ترکی سے شروع ہو کر عراق اور ایران سے ہوتے ہوئے پاکستان تک ایک فوجی اتحاد بنایا جائے۔ دورانِ گفتگو جب میں نے مڈل ایسٹ ڈیفنس آرگنائزیشن (MEDO) میں پاکستان کی ممکنہ شمولیت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: ''دیکھیے یہ آپ کا کام نہیں' آپ طالب علم ہیں' یہ کام آپ ہمارے اوپر چھوڑیے۔'' میں نے کہا: ''جناب! آپ اس ملک کو رسیوں میں باندھ کر کہیں چھوڑ جائیں گے' آخر بعد میں ہم ہی نے اسے سنبھالنا ہے۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ ناظم الدین ایک نہایت شریف انسان تھے۔ اس ملاقات کا نقشہ ذہن میں آتا ہے تو میں اب بھی حیران ہوتا ہوں۔ جواب میں انہوں نے کہا: ''دیکھیے پنڈت جی (نہرو) تو نہیں چاہتے نا کہ پاکستان قائم رہے' اور ہم اکیلے تو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے نا!'' وہ دن اور آج کا دن' ہم اسی چکر میں رہے۔ ہم نے کبھی اللہ کی مدد پر بھروسہ نہیں کیا۔ کریں بھی کیسے! اللہ سے تو ہم نے غداری کی ہے' بے وفائی کی ہے۔ ہم نے تو کہا تھا کہ تیرے دین کا نام روشن کریں گے۔ پاکستان پوری دنیا کے لیے روشنی کے ایک مینار کی مانند ہوگا۔ قائداعظم کے الفاظ میں' یہاں اسلام کے اصولِ حریت ومساوات کا ایک نمونہ پیش کیا جائے گا۔ لیکن جب ہم نے وعدہ خلافی کی اور نفاذِ اسلام کی طرف پیش قدمی نہ کی تو عدم استحکام کا شکار ہو گئے۔

باقی یہ بھی ٹھیک ہے کہ جمہوریت یہاں چلنے نہیں دی گئی۔ اس میں عام طور پر قصوروار فوج کو' سیاست دانوں کو یا پھر بیوروکریسی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی وجہ کی جانب کوئی انگلی اٹھانے کو تیار ہی نہیں۔ جمہوریت کی ناکامی کا اصل سبب جاگیرداری ہے۔ یہ جاگیردار جو بیٹھے ہوئے ہیں' ان کے آباء واَجداد نے غداری کی تھی اور آزادی کی مقامی تحریکوں کو کچلنے میں انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ اس کے صلے میں انگریز ان کو لمبے لمبے رقبے دے کر گیا اور اب یہ قوم کی گردنوں پر سوار ہیں۔ جتنا بھی

صاف شفاف الیکشن ہوگا' اتنی ہی اس بات کی صحیح عکاسی ہوجائے گی کہ نیچے کیا ہے۔ نیچے جاگیرداری ہے تو وہ اتنی ہی نمایاں ہوکر اوپر آجائے گی۔ ہماری سیاست تو ایک میوزیکل چیئر گیم ہے۔ باپ نہیں تو اس کا بیٹا ہے' بیٹا نہیں تو بھتیجا! عوامی سیاست اس ملک میں یا تو کراچی کے اندر ہے جہاں فیوڈل لارڈز کا عمل دخل نہیں ہے یا پھر پختون علاقے کے اندر ہے' اگرچہ وہاں پر بھی علماء کا کچھ عمل دخل ہے۔ تاہم یہ دونوں بھی باہم بالکل متضاد ہیں۔ جنوب کے اندر الٹرا سیکولر پارٹی ایم کیو ایم ہے جو سیکولرازم میں بے نظیر کو بھی پیچھے چھوڑ گئی ہے جبکہ شمال میں الٹرا اسلامک لوگ ہیں۔ ان کا اسلام لوگوں کو بڑا ''کھردرا'' معلوم ہوتا ہے لیکن وہ شعائر اسلامی کے بارے میں بہت حسّاس ہیں۔ بہرحال' میں اس وقت پاکستان کے حالات کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا بلکہ بتانا چاہتا ہوں کہ گلوبل معاملہ کیا چل رہا ہے!

عام طور پر ہم سوچتے ہیں کہ عراق پر حملہ کیوں کیا گیا! اب تک اس کی کوئی وجہ دریافت نہیں ہوسکی۔ جو باتیں بیان کی گئیں' وہ سب نرا جھوٹ ہیں۔ حقیقی وجہ اکثر لوگوں کے علم میں نہیں ہے۔ اسی طرح افغانستان پر زبردست حملہ کیوں کیا گیا' حالانکہ نہ اُسامہ کا جرم ابھی تک ثابت ہے اور نہ دنیا میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات میں طالبان کا کوئی حصہ ہے! طالبان نے تو افغانستان سے باہر قدم رکھا ہی نہیں' پھر انہیں کیوں گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا؟ اصل میں اِس وقت دنیا میں ایک بہت بڑا مذہبی تصادم ہو رہا ہے۔ امریکہ کی تیل پر بھی نگاہ تھی' لیکن اصل میں اسرائیل کی توسیع (extension of Israel) مقصود ہے۔ بعض خبریں بظاہر چھوٹی ہوتی ہیں' لیکن وہ اپنے اندر بہت بڑا مفہوم رکھتی ہیں۔ جب صدام کو شکست ہوئی تو فوراً بعد اسرائیل کے وزیراعظم شیرون کا بیان آ گیا تھا کہ عنقریب عراق پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ درحقیقت یہ جنگ گریٹر اسرائیل کے لیے لڑی گئی۔ دس سال پہلے جو پہلی خلیجی جنگ ہوئی تھی' اس میں امریکی آرمی کے انچارج نے صاف کہہ دیا تھا کہ ہم نے یہ جنگ اسرائیل کی حفاظت کے لیے لڑی ہے کیونکہ صدام حسین سکڈ میزائلوں کے ذریعے اسرائیل کے اندر تباہی

پھیلا سکتا تھا! تو اصل میں ان تمام معاملات کی کڑیاں باہم جڑتی ہیں۔

عراق کے معاملے میں یورپی ممالک نے امریکہ کا ساتھ نہیں دیا۔ عالمی رائے عامہ بھی اس جنگ کے حق میں نہیں تھی۔ یہ صرف دو ملکوں امریکہ اور برطانیہ کا فیصلہ تھا' کیونکہ یہ دونوں پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں۔ ان میں بہت بڑی تعداد میں نیوکون (Newcon) ہیں' جو اسرائیل سے بڑھ کر اسرائیل کے حامی ہیں اور چاہتے ہیں کہ گریٹر اسرائیل وجود میں آئے' مسجد اقصیٰ منہدم ہو اور تھرڈ ٹمپل تعمیر ہو' اور یہ سب کچھ جلد از جلد ہو' کیونکہ یہ بات ان کے دماغوں میں بٹھا دی گئی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زمین پر دوبارہ اُس وقت آئیں گے جب تھرڈ ٹمپل بن جائے گا۔ یہودیوں کی یہ مقدس ترین عبادت گاہ حضرت سلیمانؑ نے بنوائی تھی۔ ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر نے اسے گرا دیا۔ ڈیڑھ دو سو سال بعد یہودیوں نے اسے دوبارہ تعمیر کیا' لیکن ۷۰ء میں رومی جنرل ٹائٹس نے اسے پھر گرا دیا اور آج تک ان کا ''خانہ کعبہ'' گرا ہوا ہے۔ صرف ایک دیوار ہے' دیوارِ گریہ! وہ وہاں جاتے ہیں' روتے ہیں' پیٹتے ہیں' ماتم کرتے ہیں۔ یہودی سمجھتے ہیں ہمارا مسیحا آئے گا اور عیسائی سمجھتے ہیں ہمارے مسیحؑ آئیں گے' لیکن دونوں کا اس پروگرام پر اتفاق ہے کہ جب تک تھرڈ ٹمپل نہیں بنے گا' حضرت عیسیٰؑ نہیں آئیں گے!

اب اسی طریقے سے سمجھئے کہ افغانستان کا معاملہ کیا ہے! افغانستان میں انہیں اندیشہ ہو گیا کہ اسلام کہیں ایک نظام کی حیثیت سے اُبھر کر دنیا کی نگاہوں میں نہ آ جائے۔ ساٹھ ستر سال پہلے علامہ اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے عنوان سے نظم لکھی تھی۔ اس کے مطابق ابلیس نے کہا تھا کہ ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اِس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

یعنی مجھے اشتراکیت سے کوئی اندیشہ نہیں' یہ تو ہمارا اپنا بنایا ہوا نظام ہے۔ جمہوریت سے کوئی اندیشہ نہیں' اس لیے کہ ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

اور ؎

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

ہاں ڈر ہے تو اس امت سے ہے۔ اس امت کے اندر آرزو کی چنگاری دبی ہوئی ہے۔ کس قدر پیاری تشبیہ دی ہے! جب انگارے کے اوپر راکھ آ جائے تو پھر وہ انگارہ نظر نہیں آتا، کہیں دھوکا کھا کے اسے ہاتھ میں اٹھا لیا جائے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ یہ کیا شے ہے۔ ع جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو! اسی نظم میں ابلیس کہتا ہے ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اب زمانہ ادھر جا رہا ہے۔ زمانوں نے بہت سی کروٹیں لی ہیں۔ بادشاہت سے نجات پائی۔ فرانسیسی انقلاب آیا۔ جمہوریت آ گئی۔ جمہوریت نے سرمایہ داری کی شکل اختیار کر لی۔ عوام پہلے جاگیرداروں کے رحم و کرم پر تھے، اب سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر آ گئے۔ پھر کروٹ لی تو کمیونزم آ گیا۔ ایک پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ قائم ہوگئی۔ کمیونزم بھی مر گیا۔ اب زمانہ کدھر جا رہا ہے؟ حالات بتا رہے ہیں کہ اب اس کا رخ اسلام ہی کی طرف ہے اور یہ دنیا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے نظام کی تلاش میں ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا: ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو

یا زنورِ مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ ست

چنانچہ انہیں وہاں یہ خطرہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ طالبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑے ہی اکھڑ قسم کے لوگ تھے‘ دنیاوی طور پر زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں تھے‘ مسجد کے مولوی یا مدرسوں کے طلاب تھے‘ لیکن انہوں نے اسلامی حدود و تعزیرات کے نفاذ سے افغانستان میں امن قائم کر کے دکھا دیا۔ یہ درست ہے کہ حکومت چلانے میں ان سے بہت سی غلطیاں بھی ہوئیں۔ وہ کوئی منظّم جماعت تو تھی نہیں۔ روسیوں کے جانے کے بعد مجاہدین آپس میں لڑ پڑے تو طالبان کے لیے راستہ خود بخود کھل گیا۔ اس کے لیے انہیں کچھ زیادہ جان کی قربانی بھی نہیں دینی پڑی۔ وہاں اگرچہ ابھی تک اسلام کا نظامِ ریاست اور نظامِ معیشت سامنے نہیں آیا تھا‘ تاہم چند شرعی سزائیں نافذ کی گئیں جن سے پورے انغانستان میں امن ہو گیا۔ اس کے برعکس اب اربوں ڈالر خرچ کر کے بھی وہاں اندرونی استحکام نہیں ہے۔ پوست کی کاشت میں کوئی کمی نہیں آ رہی ہے۔ امریکہ کی کٹھ پتلی حکومت بھی کچھ نہیں کر سکی۔ حامد کرزئی مکمل طور پر غیر ملکی فوجیوں کے حفاظتی حصار میں رہتے ہیں۔ جان لیجیے کہ یہ تھا اصل میں افغانستان کا مسئلہ!

اس کی وجہ کیا ہے؟ احادیث میں اس کی خبر موجود ہے۔ جب آخری شوڈاؤن ہو گا تو ایک طرف عیسائی اور یہودی ہوں گے جبکہ دوسری طرف مسلمان۔ وہ آخری سٹیج آنے والی ہے جب دجال اکبر یہودیوں کی قیادت کر رہا ہو گا اور مسلمانوں کی قیادت حضرت مہدی کے ہاتھ میں ہو گی۔ اس موقع پر ایک تو آسمان سے حضرت مسیح علیہ السلام نازل ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ نے زندہ اٹھا لیا تھا۔ یہ عقیدہ ہمارے اور عیسائیوں میں مشترک ہے۔ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اٹھا لیے گئے‘ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ زندہ اٹھا لیے گئے۔ وہ بھی سمجھتے ہیں دوبارہ آئیں گے‘ ہمیں بھی یقین ہے کہ آئیں گے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عیسائی سمجھتے ہیں کہ انہیں صلیب دے دی گئی‘ وہ سولی پر چڑھ کر فوت ہو گئے‘ پھر زندہ ہو کر اوپر چلے گئے جبکہ ہمارا ایمان قرآن مجید کی سورۃ النساء کی آیت ۱۵۷ کے مطابق یہ

ہے کہ: ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ وہ نہ تو قتل ہوئے اور نہ انہیں سولی دی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بچایا اور اپنی طرف اٹھا لیا۔ اس حوالے سے ایک تو آسمان سے حضرت مسیح علیہ السلام اتریں گے اور دوسری طرف خراسان کے علاقے سے فوجیں آئیں گی جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ مل کر دجال اور یہودیوں کا مقابلہ کریں گی۔

یہ روایت جو ہمارے ہاں موجود ہے، میں سمجھتا ہوں کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے لٹریچر میں بھی موجود ہے۔ ایک مثال سے اس کو واضح کرتا ہوں۔ حدیث میں آتا ہے کہ اُس وقت یہ صورت حال ہوگی کہ اگر یہودی کسی درخت کے پیچھے چھپے گا تو وہ درخت پکارے گا: اے مسلمان! میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے، آؤ اسے قتل کرو۔ کسی چٹان کے پیچھے چھپے گا تو چٹان پکارے گی۔ البتہ ایک درخت ''غرقد'' ہے جو یہودیوں کو پناہ دے گا۔ لہٰذا آج اسرائیل میں بڑے پیمانے پر غرقد کے درخت لگائے جا رہے ہیں۔ گویا ہمارے ہاں جو روایات ہیں، ان کے ہاں بھی موجود ہیں اور وہ ان کے حوالے سے اپنی پلاننگ کرتے ہیں۔

خراسان کے علاقے کے بارے میں مَیں نے ایک زمانے میں بڑی تحقیق کی تھی۔ ایک خراسان تو آج ایران کا چھوٹا سا صوبہ ہے، جس میں اہل تشیع کا مقدس ترین اور متبرک ترین مقام مشہد واقع ہے۔ لیکن جو خراسان آنحضور ﷺ کے زمانے میں تھا، یوں سمجھیے کہ اس کا نیوکلیس موجودہ افغانستان ہے۔ اس کا ایک کنڈا پاکستان میں مالاکنڈ سے اوپر کا علاقہ ہے جس میں سوات، باجوڑ، دیر اور چترال شامل ہیں۔ اسی طرح ایران کا وہ صوبہ بھی پرانے خراسان کا حصہ ہے۔ یہاں سے سیاہ جھنڈے لے کر فوجیں جائیں گی جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ کھڑے ہو کر یہودیوں کا اور ان کے لیڈر دجال کا مقابلہ کریں گی۔ دجال کو حضرت مسیح علیہ السلام اپنے ہاتھ سے قتل کریں گے۔

اس حوالے سے ایک نکتے پر خاص طور پر غور کیجیے کہ کیا وجہ ہے کہ عراق کی مہم میں یورپ اور دیگر ممالک نے امریکہ کا ساتھ نہیں دیا لیکن افغانستان کی مہم میں سب شریک ہو گئے؟ افغانستان میں نیٹو کی فوجیں ہیں، جو عموماً کیتھولکس ہیں، اس لیے کہ انہیں اندیشہ

ہے کہ یہاں سے اسلام کا احیاء (resurgence) ہوسکتا ہے' لہٰذا وہ اس کو یہیں پر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے اتنی بڑی سازش تیار کی گئی اور اپنے ہاتھوں اپنے Twin towers تباہ کر دیے گئے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ سب کچھ امریکہ کے نیوکون نے خود کیا۔ وہ اس حوالے سے کوئی اور تحقیق سامنے نہیں آنے دیتے تاکہ امریکہ کی رائے عامہ ایک بہت بڑی جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے پوری دنیا کے عیسائی اکٹھے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ جو کچھ افغانستان میں ہو رہا ہے اس میں امریکہ کو روس کی بھی آشیر باد حاصل ہے اور چین کی بھی حمایت حاصل ہے۔ آپس میں دشمن ہیں لیکن اس معاملے میں سب متفق ہیں۔ اسلام کے خلاف کفر ملتِ واحدہ ہے۔

اب جو بات آج کہنے کی ہے' وہ یہ ہے کہ افغانستان کی جنگ میں اگر طالبان اپنی زبردست شکست کے باوجود کھڑے نہ رہتے اور جانوں کی قربانی نہ دیتے تو اب تک پاکستان کی بھی باری آ چکی ہوتی! ان کی مزاحمت کی وجہ سے امریکہ اور نیٹو ممالک آگے نہیں بڑھ رہے ہیں' ورنہ اگلا ٹارگٹ تو پاکستان ہی تھا۔ خود جنرل پرویز مشرف نے کہا تھا کہ کوشش کر رہے ہیں کہ اگلی باری ہماری نہ ہو۔ اسی طرح ہمارے وزیر خارجہ نے بھی بیان دیا تھا کہ ایسی صورت حال ممکن ہے کہ پاکستان کے ساتھ بھی عراق جیسا معاملہ کیا جائے! سب کو معلوم ہے کہ پاکستان کا ایٹم بم کسی کو ہضم نہیں ہو رہا۔ وہ کسی کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ ان کے مفکرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اسلامی بنیاد پرستی (Islamic fundamentalism) کا اصل گہوارہ پاکستان اور سعودی عرب ہیں' لہٰذا اِدھر اُدھر مہمیں کرنے کے بجائے وہاں حملے کرو۔ یہ ساری تدبیریں اسلام کا راستہ روکنے کے لیے ہو رہی ہیں۔ اب یہ جنگ ہمارے ملک کے اندر آ گئی ہے۔ ایک بہت بڑے فلسفی' مؤرخ اور مصنف شکیب ارسلان کا قول ہے کہ ہمارے شمال میں جو دو پہاڑی سلسلے چلتے ہیں' ایک پامیر کی سطح مرتفع سے کوہ ہمالیہ جنوب مشرق کی طرف' جبکہ دوسرا کوہ ہندوکش جو جنوب مغرب کی طرف جا رہا ہے' ان کے درمیان میں جو مثلث بنتی ہے یہاں وہ لوگ آباد ہیں کہ اگر پوری دنیا میں اسلام کی نبضیں ڈوب بھی جائیں تب بھی اس علاقے میں

اسلام کی نبض چلتی رہے گی۔ ان کے خون میں اسلام ہے' شریعت ہے' شعائر اسلامی کی حمیت ہے۔ آج وہاں پر اگر تین تین سو آدمیوں نے ہتھیار ڈالے ہیں تو یونہی تو نہیں ڈال دیے۔ آخر فوجی تھے' ہتھیار ان کے پاس تھے۔ اب ان کی رہائی کے لیے ایسے مذاکرات ہو رہے ہیں جیسے کسی دوسرے ملک کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ وہاں پر اب ان کی اپنی حکومت ہے' ان کے اپنے قوانین نافذ ہیں' ان کی اپنی عدالتیں ہیں۔ اس معاملے کو اگر تشدد کے ساتھ دبایا گیا تو یہ آگ اور بھڑکے گی' یہ آگ بجھنے والی نہیں ہے!

اب بھی اگر ہم ہوش میں نہ آئے اور پاکستان میں شریعت اسلامی کا نفاذ نہ کیا تو اس ملک کا وجود نہیں رہے گا۔ ناممکن ہے کہ رہے! ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو ہم نے ''قراردادِ مقاصد'' پاس کر لی تھی۔ اس میں گویا پاکستان میں خلافت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ خلافت کا مطلب ہے کہ حاکمیت اللہ کی اور نیابت انسانوں کی! سب سے اوپر اللہ اور اس کے رسولؐ کا قانون ہو جبکہ اس کے نیچے باہمی مشورے سے معاملات طے کیے جائیں۔ پھر ۱۹۵۰ء میں جب یہ کہا گیا کہ کس کا اسلام نافذ کیا جائے: شیعوں کا' سنیوں کا' دیوبندیوں کا' بریلویوں کا یا اہل حدیث کا؟ تو تمام فرقے جمع ہو گئے اور انہوں نے بائیس اصول مرتب کر دیے کہ ہم متفق ہیں' ہمارا کوئی اختلاف نہیں۔ آؤ' بناؤ اسلامی دستور! بعد میں مذہبی جماعتوں سے اندرونی طور پر ایک غلطی ہوئی کہ وہ پاور پالیٹکس میں کود پڑیں۔ ان کا کام تھا کہ اقتدار کی خواہش رکھنے کے بجائے پریشر گروپ کی حیثیت سے نفاذِ اسلام کا مطالبہ کرتے رہتے۔ جس طرح مطالبے کے تحت انہوں نے ''قراردادِ مقاصد'' پاس کروالی تھی اور اس کے بعد اسی طرح ۱۹۵۶ء کا دستور بنوا لیا تھا' وہ اسی راستے پر چلتے رہتے۔ تو ایک تو ہمارے ہاں اندرونی غلطی ہوئی' جبکہ ایک باہر سے یہودیوں اور ان کے سرپرستوں نے سازش تیار کی اور لیاقت علی خان کو قتل کرا دیا گیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے قراردادِ مقاصد پاس کرائی تھی اور یہ عالم کفر کے حلق سے اترنے والی شے نہیں تھی۔ یہودیوں نے تو صدیوں محنت کر کے سیکولرازم کو رواج دیا تھا کہ مذہب کا ریاست اور حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء کا دستور بن گیا۔ پھر ایوب خان

کو امریکہ بلایا گیا اور کہا گیا کہ جاؤ وہاں پر مارشل لاء لگاؤ۔ اس اعتبار سے ایک تو باہر کی سازش ہے اور دوسرے ہماری اندرونی غلطی کی وجہ سے آج تک یہاں اسلام نہیں آیا۔ اب بھی راستہ یہی ہے کہ دستوری عمل کو آگے بڑھایا جائے اور اسی کے تحت یہاں پر اسلامی قوانین کا نفاذ ہو۔ اس کے لیے تنظیم اسلامی نے دستوری ترمیم کا ایک مسودہ تیار کر کے پیش بھی کیا، لیکن بدقسمتی سے ایم ایم اے کے کسی بھی راہنما نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ یہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ اگر اس طریقے سے یہاں اسلام نہ آیا تو پھر یہ آگ جو آج شمالی کنارے پر لگی ہے، بجھنے والی نہیں ہے۔ تشدد سے آج تک کوئی تحریک دبی نہیں۔ ان لوگوں کے اندر دینی حمیت، غیرت اور حریت کا جو مادہ ہے، اسے کوئی طاقت دبا نہیں سکتی۔ پھر یہ معاملہ اُدھر سے آئے گا۔ لیکن چاہیے یہ کہ اس سے پہلے ہم خود ایک بہتر انداز میں، تدریجی طور پر یہاں شریعت اسلامی کے نفاذ کا بندوبست کریں!

(مرتب: محمد خلیق)

# رسالتِ محمدی ﷺ کی خصوصیات

## قرآن وحدیث کی روشنی میں

مسز آصف پراچہ ☆

### رسالتِ محمدیؐ

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جو نظام بنایا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف قوموں کے پاس اللہ کے رسول وحیٔ الٰہی لے کر آئے اور انہوں نے اپنی زندگی اور اُسوۂ حسنہ سے ان تعلیمات کے عملی پہلو کو روشن کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ اس نے انسان کو اوّل روز سے ہی نبیوں کی رہنمائی سے سرفراز فرمایا ہے۔ پہلا انسان نبی تھا اور اس طرح تاریخ انسانی کا آغاز ہدایت اور روشنی میں ہوا' ظلمات اور تاریکی میں نہیں۔ پھر یہ روشن سلسلہ جاری رہا اور ہر دَور اور ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے سے اپنی ہدایت انسانوں تک پہنچائی۔ اس سلسلے کی آخری کڑی حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جو کمالات ومعجزات عطا فرمائے تھے' نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارک میں وہ تمام کمالات جمع فرما دیے:

حسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰؑ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

رسالتِ محمدیؐ کی نمایاں اور بڑی خصوصیات میں سے چند ایک یہ ہیں:

### ۱) رسالتِ عامّہ

آنحضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے پہلے جتنے انبیاء اور رسول اللہ نے بھیجے وہ اللہ کا پیغام کسی خاص قوم یا علاقے تک پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے' جبکہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی

☆ رفیقۂ تنظیم اسلامی' حلقہ خواتین کراچی

یہ خصوصیت تھی کہ انہیں تمام جہان والوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا' نہ صرف اُس وقت کے لیے بلکہ قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے۔ آپ ﷺ کو شریعت دے کر اللہ نے نبوت کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ حضرت محمد ﷺ پہلے اور آخری رسول اور نبی ہیں جن کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوئی۔

یہ مضمون قرآن مجید میں پانچ مرتبہ مختلف الفاظ میں آیا ہے۔ سب سے واضح انداز میں سورۂ سبا میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا.....﴾ (آیت ۲۸)

''(اے محمدؐ!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر.....''

سورۃ الانبیاء میں فرمایا:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾

''ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا.....﴾(الاعراف:۱۵۸)

''(اے محمدؐ!) کہہ دو اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں.....''

## ۲) نسخ شرائع سابقہ

پہلی آسمانی شریعتیں محدود وقت' محدود علاقے اور متعین قوم کے لیے ہوتی تھیں' اس لیے ان میں اس وقت کے حالات اور تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی شریعت دائمی اور عالمگیر ہے جس نے پہلی تمام شریعتوں کے قوانین کو منسوخ کر دیا۔ اب نجات کے لیے ضروری ہے کہ صرف شریعت محمدی پر عمل کیا جائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ (البقرۃ:۱۰۶)

''ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو لے آتے ہیں اس سے بہتر یا اس جیسی۔''

## ۳) تکمیل دین

اللہ تعالیٰ کا دین ہر زمانے اور ہر دَور میں ایک ہی رہا ہے اور وہ ہے ''اسلام''۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۱۹)

''بے شک دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔''

دین کی بنیادی تعلیمات تمام انبیاء کے ہاں یکساں رہی ہیں۔ البتہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور قرآن حکیم کے نزول سے اس دین کو مکمل کر دیا گیا اور زندگی کے تمام شعبوں میں ایسی راہنمائی مہیا کر دی گئی کہ قیامت تک آنے والے حالات کے لیے قرآن حکیم سے براہِ راست یا بالواسطہ ہدایات مل سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے بطور دین پسند کیا۔''

یعنی اب دین اسلام ہر طرح سے جامع اور مکمل ہے۔ اس میں قیامت تک کسی ترمیم، تنسیخ یا اضافے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سلسلۂ نبوت و رسالت کی تکمیل کا اعزاز ''رسالت محمدیؐ'' کو حاصل ہے۔

## ۴) حفاظتِ کتاب

انبیاء کرام علیہم السلام پر خداوند کریم کی طرف سے آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوتے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کتب کی حفاظت کا ذمہ کبھی نہیں لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تورات اور انجیل اپنی اصل حالت میں دستیاب نہیں، ان میں تحریف کی گئی ہے اور کئی آسمانی صحیفے ایسے ہیں جن کا نام بھی ہم نہیں جانتے۔ مگر خاتم النبیین والمرسلین حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب ''قرآن مجید'' آج چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اپنی اصل شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کے ایک حرف میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکی، کیونکہ اس مقدس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود خالق کائنات، قادرِ مطلق نے لیا تھا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر)

''بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اُتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔''

قرآن حکیم کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ یہ نہ صرف تحریری طور پر موجود ہے بلکہ بے شمار حفاظ کے سینوں میں بھی محفوظ ہے۔

## ۵) سنّتِ نبوی کی حفاظت

اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ اس طرح محفوظ فرمائی کہ تاریخ انسانی میں کسی نبی، کسی بادشاہ، کسی فاتح اور کسی قائد کی زندگی اس طرح محفوظ نہیں رکھی جا سکی۔ ختم نبوت کا اعلان ہی اس بات کی علامت ہے کہ آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کو قیامت تک زندہ رکھنے کی ذمہ داری لے لی گئی ہے تاکہ آپؐ کی زندگی سے قیامت تک کے لوگ رہنمائی حاصل کرتے رہیں اور کسی نئے رسول کی ضرورت باقی نہ رہے۔

سنت، قرآن حکیم کی شرح ہے، اس لیے قرآن حکیم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ سنت کی حفاظت کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

## ۶) سیرتِ محمدیؐ کی ہمہ گیری

رسول کریم ﷺ نے حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں اور شعبوں کے لیے ایک نمونۂ عمل پیش فرمایا، مثلاً معاشرت، معیشت، سیاست، تجارت، عبادات، ایمانیات اور اخلاقیات وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم آنحضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ بچوں کے معاملات ہوں یا بڑوں کے، گھریلو معاملات ہوں یا سیاسی، ہمسائیگی کے تعلقات ہوں یا رشتہ داری کے، زمانۂ امن ہو یا جنگ، غرض زندگی کے ہر میدان میں ہدایت و رہنمائی مل سکتی ہے۔ آنحضور ﷺ کی اس اعلیٰ اور کامل ترین راہنمائی کے بارے میں قرآن حکیم میں بڑے واضح انداز میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔''

## ۷) ختم نبوت، تکمیل رسالت

رسول کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے پیغمبری کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام ہدایت حضرت محمد ﷺ کے ذریعے تمام انسانوں تک پہنچا دی۔ اب جو شخص حق کا طالب ہو اور خدا کا مسلم بننا چاہتا ہو اس پر لازم ہے کہ خدا کے آخری نبی ﷺ پر ایمان لائے، جو کچھ تعلیم

انہوں نے دی ہے اس کو مانے اور جو طریقہ انہوں نے بتایا ہے اس کی پیروی کرے۔ آپؐ سے پہلے آنے والے تمام انبیاء اپنی اُمتوں کو ایک آنے والے عظیم نبی کی بشارت دیتے رہے' مگر آپؐ نے کسی آنے والے نبی کی بشارت دینے کے بجائے نبوت کا دعویٰ کرنے والے کو کذاب کہا۔ آپؐ کا ختم نبوت کا اعلان ہر اُمتی پر ایک بڑا احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف آپؐ پر نبوت کا خاتمہ کر دیا بلکہ دین کو مکمل کر کے رسالت کی بھی تکمیل کر دی' جو کہ حضور ﷺ کی بہت بڑی خصوصیت اور ان کا خاص اعزاز ہے۔

قرآن' حدیث اور اجماعِ اُمت' تینوں سے ختم نبوت نبی اکرم ﷺ پر ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍمِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط﴾(الاحزاب: ٤٠)

''(لوگو!) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں''۔

ختم نبوت کا مضمون متعدد احادیثِ نبویہؐ میں آیا ہے۔ ان میں سے چند احادیث پیش کی جاتی ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد بیان فرمایا کرتے تھے کہ:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ' كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ' وَاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ .....)) (متفق علیہ)

''بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کے ہاتھ میں تھی' جب بھی کسی نبی کا انتقال ہوتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا' لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں' بلکہ اب خلفاء ہوں گے.....''

(۲) بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غزوۂ تبوک کے لیے نکلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کیا تو انہوں نے کہا: کیا آپؐ مجھے پیچھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا تَرْضٰى اَنْ تَكُوْنَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى؟ اِلَّا اَنَّهٗ لَيْسَ نَبِيٌّ

**بَعْدِیْ))** (متفق علیہ)

''کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میرے ساتھ تمہاری نسبت وہی ہو جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی؟ مگر یہ واضح رہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

(۳) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

**((وَاِنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ ثَلَاثُوْنَ كَذَّابُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ نَبِيٌّ ' وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ))** (سنن الترمذی و سنن ابی داؤد)

''میری اُمت میں تیس کذاب ہوں گے' ان میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا' لیکن بلاشبہ میں خاتم النبیین ہوں' میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

(۴) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

**((اِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ وَلَا نَبِيَّ))**

(سنن الترمذی و مسند احمد)

''بلاشبہ رسالت اور نبوت کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے' پس میرے بعد نہ تو کوئی رسول ہے اور نہ ہی نبی''۔

(۵) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس الوداع کرنے والے شخص کی مانند تشریف لائے اور فرمایا:

**((اَنَا مُحَمَّدٌ النَّبِيُّ الْاُمِّيُّ)) قَالَهٗ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ((وَلَا نَبِيَّ بَعْدِيْ .....))**

''میں ہوں محمد نبی اُمّی''۔ آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا ـــــ ''اور میرے بعد کوئی نبی نہیں.....'' (مسند احمد)

(۶) حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کا ایک طویل خطبہ نقل ہوا ہے' جس میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((..... **وَاَنَا آخِرُ الْاَنْبِيَاءِ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ .....**)) (سنن ابن ماجه)

''.....اور میں آخری نبی ہوں اور تم آخری اُمت ہو.....''

قرآن و حدیث کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین مقام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کو حاصل ہے اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس بات پر اجماع تھا کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا'

صحابہ کرامؓ نے ان کے خلاف جہاد کیا۔ چنانچہ ایک مسلمان کی حیثیت سے آنحضورﷺ کو رسول برحق ماننے کے ساتھ ساتھ آخری نبی تسلیم کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

ربیع الاول کے مہینے میں میلاد النبی کی محافل منعقد کرنا اور جلوس نکالنا مشروع نہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ قرآن وسنت کا علم حاصل کریں اور پھر اس کے مطابق عمل کریں۔رسول اللہﷺ کی سب سے بڑی سنت یہ ہے کہ اللہ کے دین کو روئے ارضی پر نافذ کرنے کی پرخلوص جدوجہد کی جائے تاکہ کفر کی تاریکی دنیا سے ختم ہو جائے اور حق کا نور جگمگانے لگے۔بقول علامہ اقبال:۔

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

۞ ۞ ۞

# نبی کریم ﷺ اور محروم طبقات

عتیق الرحمٰن صدیقی

حضور نبی کریم ﷺ غارِ حرا میں اپنی معمول کی عبادت میں مصروف' اللہ سے لَو لگائے ہوئے تھے کہ اچانک ایک فرشتہ نمودار ہوا' اس نے آپؐ سے کہا کہ پڑھو' حضور ﷺ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں' اس پر وہ حضور ﷺ سے بغل گیر ہوا اور آپؐ کو اتنے زور سے بھینچا کہ آپؐ کو تکلیف ہونے لگی۔ فرشتے نے اپنا یہ عمل تین بار دہرایا اور ہر بار آپؐ کو پڑھنے کا حکم دیا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝۳ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝۵﴾

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو پیدا کیا خون کی پھٹکی سے۔ پڑھ اور تیرا رَب بڑا ہی کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا''۔

آپؐ کے لیے یہ ایک نامانوس اور انوکھا تجربہ تھا' آپؐ گھبرا سے گئے' انتہائی سراسیمگی اور خوف کے عالم میں کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہ ؓ کے پاس پہنچ کر کہا: ''مجھے اڑھاؤ' مجھے اڑھاؤ''۔ چنانچہ آپؐ کو کمبل اڑھا دیا گیا۔ آپؐ کی طبیعت ذرا سنبھلی تو فرمایا: ''اے خدیجہؓ! مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' پھر سارا قصہ آپؐ نے ان کو سنایا اور کہا ''مجھے اپنی جان کا ڈر ہے''۔ اس پر حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ نے فرمایا: ''ہرگز نہیں خدا کی قسم! اللہ آپ ﷺ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا' کیونکہ آپ ﷺ غریبوں کی امداد کرتے ہیں' مقروضوں کا قرض اتارتے ہیں' مصیبت میں لوگوں کے کام آتے ہیں' حق کی حمایت کرتے ہیں' مہمانوں کی عزت کرتے ہیں' قرابت داروں کا حق ادا کرتے ہیں''۔ (بخاری' بدءالوحی)

حضرت خدیجہ ؓ نے جن الفاظ میں حضور نبی کریم ﷺ کو تسلی دی وہ آپؐ کی نبوت

سے قبل زندگی کے محامد و مکارمِ اخلاق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نبوت کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد آپؐ تمام کمالات کا مرقع تھے۔ حسنِ اخلاق اپنی تمام تر رعنائیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ آپؐ کی ذاتِ اطہر میں ضوفشاں تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب خلق مصطفویؐ کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: **ان خلق رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان القرآن** ''آپؐ کا اخلاق قرآن تھا''۔ (ابوداؤد) قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہوکر فرمایا:

**﴿اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی ۝ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۝ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ۝﴾** (الضحیٰ)

''(اے محمدؐ!) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس (ربّ العالمین) نے آپ (ﷺ) کو یتیم پایا تو ٹھکانا بخشا اور آپ (ﷺ) کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو سیدھا راستہ بتلا دیا اور نادار پایا تو غنی کر دیا۔ لہٰذا کسی یتیم پر سختی نہ کیجیے اور نہ کسی سائل کو جھڑکئے اور اپنے ربّ کے احسانات کو بیان کرتے رہیے۔''

اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر بے شمار احسانات کیے' آپؐ یتیم تھے تو اللہ نے لطف و کرم کی آغوش آپؐ کے لیے کشادہ فرمائی' تربیت و نگہداشت کا عمدہ اہتمام فرمایا' آپؐ تنگ دست تھے تو آپؐ کو غنی کیا' بے حساب نعمتیں عطا فرمائیں' آپ جویائے راہ تھے' اللہ نے آپ ﷺ کی خلش کو دُور فرمایا اور صراطِ مستقیم پر گامزن کر دیا۔ ارشاد ہوا کہ آپؐ ان انعامات کا شکرانہ یوں ادا کریں کہ بیوگان اور یتامیٰ کے ساتھ محبت اور ملائمت کا رویہ اختیار کریں اور اپنی بے پایاں شفقتوں اور مؤدتوں کے دروازے سب کے لیے کھول دیں اور بے اعتنائیوں سے ہمیشہ کے لیے مجتنب رہیں۔ ایک شخص نے جب بارگاہِ رسالت میں اپنی سنگدلی کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا دل نرم ہو جائے تو یتیم کے سر پر دستِ شفقت پھیرا کرو اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو''۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو احکامات دیے اللہ کے رسول ﷺ نے من وعن وہ اُس کے بندوں تک پہنچا دیے' صرف کہہ سنانے اور پیغام دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ عملاً اس کا نمونہ بھی پیش فرمایا۔ آپؐ یتیموں' بے کسوں اور بے یار و مددگار لوگوں کا پورا پورا خیال فرماتے تھے۔ آپؐ

کے قول وعمل میں ہرگز کوئی مغائرت نہ تھی۔ مشرکینِ مکہ کو یتیم کا حق مار کھانے میں کوئی عار نہ تھا' وہ انہیں دھتکارتے تھے اور ظلم وستم کا تختۂ مشق بھی بنائے رکھتے تھے۔ قرآن نے ان کے رُخِ کردار کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

﴿فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۙ﴿۲﴾ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ﴿۳﴾﴾ (الماعون)

''وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اُکساتا۔''

قاضی ابوالحسن ماوردی اپنی کتاب ''اعلام النبوۃ'' میں لکھتے ہیں کہ ابوجہل ایک یتیم کا وصی تھا' وہ بچہ ایک روز اس حالت میں اس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے۔ اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال سے وہ اسے کچھ دے دے مگر اس ظالم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہِ شرارت اس سے کہا کہ محمد (ﷺ) کے پاس جا کر شکایت کر' وہ ابوجہل سے سفارش کریں گے اور تجھے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بے چارہ ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضور سے کیا تعلق ہے اور یہ بدبخت اسے کس غرض کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضور ﷺ کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپؐ سے بیان کیا۔ آپؐ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اُسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپؐ کو دیکھ کر اس نے آپؐ کا استقبال کیا اور جب آپؐ نے فرمایا کہ اس بچے کا حق اسے دے دو تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے' وہ کسی مزے دار جھڑپ کی اُمید کر رہے تھے' مگر جب انہوں نے معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے اور اسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (ﷺ) کے دائیں بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا اگر میں نے ذرا بھی ان کے خلاف حرکت کی''۔ (اعلام النبوۃ' بحوالہ تفہیم القرآن' جلد ششم)

گویا حضور ﷺ نے ایک محروم کو اس کا حق دلانے کے لیے اپنے ایک بدترین دشمن کے ہاں جانے میں بھی تأمل سے کام نہ لیا۔

نیکی اور بھلائی کا جو تصور قرآن نے پیش کیا ہے اس میں عقائد وایمانیات اور عبادات کے پہلو بہ پہلو محروم طبقات کی معاونت پر بھی زور دیا ہے۔ فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰـكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۷۷)

''نیکی (بس یہی) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف بلکہ نیکی (تو اصلاً) یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔''

نیک لوگوں کا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝﴾ (الدھر)

''اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔''

سورۃ البلد میں ارشاد فرمایا:

﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِىْ يَوْمٍ ذِىْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝﴾

''اور دو نمایاں راستے اسے (یعنی انسان کو) (نہیں) دکھا دیے؟ مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔''

ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''وہ کون سا خرچ اور مال کا کون سا مصرف ہے جو اخلاق کی پستیوں میں گرانے کے بجائے آدمی کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے' مگر اس میں نفس کی کوئی لذت نہیں ہے بلکہ آدمی کو اس کے لیے اپنے نفس پر جبر کر کے ایثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی کسی غلام کو خود آزاد کرے یا اس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لے یا کسی غریب کی گردن قرض کے جال سے نکال لے یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی تاوان کے بوجھ سے لد گیا ہو تو اس کی جان اس سے چھڑائے۔ اسی طرح وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم (یعنی رشتہ دار یا پڑوسی یتیم) اور کسی ایسے محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ ہو''۔ (تفہیم القرآن ششم' البلد' حاشیہ ۱۲)

حضور نبی کریم ﷺ نے ان محروم طبقوں کی دستگیری کی بڑی فضیلت بیان فرمائی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص نے ایک مؤمن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچالے گا' ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ' پاؤں کے بدلے میں پاؤں' شرم گاہ کے بدلے میں شرم گاہ۔'' (بخاری و مسلم)

مساکین کی مدد کے بارے میں فرمایا:

((اَلسَّاعِیُ عَلَی الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْکِیْنِ کَالْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ)) وَاَحْسِبُهٗ قَالَ : ((وَکَالْقَائِمِ لَا یَفْتُرُ وَکَالصَّائِمِ لَا یُفْطِرُ))(متفق علیه)

''بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا''۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو نماز میں کھڑا رہے اور آرام نہ لے اور وہ جو پے در پے روزے رکھے اور کبھی روزہ نہ چھوڑے۔''

یتیموں کے بارے میں حضور ﷺ کے بے شمار ارشادات ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((کَافِلُ الْیَتِیْمِ لَهٗ اَوْ لِغَیْرِهٖ اَنَا وَهُوَ کَهَاتَیْنِ فِی الْجَنَّةِ)) وَاَشَارَ مَالِکٌ بِالسَّبَابَةِ وَالْوُسْطٰی (صحیح مسلم)

''میں اور وہ شخص جو کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے' جنت میں ان

دوانگلیوں کی طرح ہوں گے''۔ امام مالکؒ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کیا''۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی نقل کرتے ہیں کہ:

''مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے نیک سلوک ہو رہا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے برا سلوک ہو رہا ہو''۔ (بخاری)

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے متقین کی یہ اہم صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے رب کا حق پہچانتے اور ادا کرتے ہیں بلکہ بندوں کے ساتھ بھی ان کا معاملہ ایثار کا ہوتا ہے:

﴿وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (الذّٰریٰت)

''اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔''

حضور نبی کریم ﷺ کے ہاں راحت و تعیش کے سامان کا کوئی گزر نہ تھا' آپؐ فقر و فاقہ کی سختیاں خود بھی برداشت کرتے رہے اور مسکین اور بے نواؤں کی چارہ سازی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آپؐ نے اپنے عمل سے محنت کش اور مزدور کو عزت سے نوازا' اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کیا۔ مسجد قبا کی تعمیر کا آغاز ہوا تو صحابہ کرام ؓ کے ساتھ آپؐ بھاری پتھر اٹھا کر لاتے تھے' صحابہؓ عرض کرتے: یا رسول اللہ! آپ رہنے دیجیے' ہم جو اٹھا رہے ہیں' مگر آپؐ برابر پتھر اٹھا کر لاتے رہے۔ مسجد نبوی کی تعمیر شروع ہوئی تو آپؐ صحابہ کے ساتھ مل کر کچی اینٹیں بنانے کا کام کرتے رہے۔ صحابہ کرام ؓ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے اور یہ شعر پڑھتے:

لئن قعدنا والنبی یعمل
فذاک منا العمل المفصل

''اگر ہم بیٹھ جائیں اور نبی ﷺ کام کریں تو ہمارا بیٹھ جانا بہت ہی برا عمل ہوگا''۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''کسب معاش کرنے والوں میں سب سے بہتر محنت کش ہے جب وہ اخلاص سے کام کرتا ہے''۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر جب عرب کے تمام تر مشرک قبائل نے مدینہ طیبہ پر دھاوا بول دیا تو اس موقع پر خندق کھودنے کا منصوبہ طے ہوا۔ صحابہ کرام ؓ کے ساتھ حضور ﷺ بھی خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ روح پرور منظر بڑا ہی کیف زا تھا' صحابہؓ بے خودی میں یہ شعر پڑھ رہے تھے:

نَحۡنُ الَّذِیۡنَ بَایَعُوۡا مُحَمَّدَا

عَلَی الۡجِھَادِ مَا بَقِیۡنَا اَبَدَا

''ہم جاں فروش ہیں جنہوں نے محمد مصطفیٰ ﷺ کے دستِ مبارک پر تا دمِ واپسیں جہاد کرنے کی بیعت کی ہے''۔

سرورعالم ﷺ اپنے ساتھیوں کے جذبۂ ایمانی سے مسرور ہو کر فرماتے:

اَللّٰھُمَّ لَا عَیۡشَ اِلَّا عَیۡشُ الۡاٰخِرَۃِ

فَاغۡفِرِ الۡاَنۡصَارَ وَالۡمُھَاجِرَۃ

''اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ الٰہی میرے انصار اور مہاجرین کو بخش دے''۔

قرآن حکیم نے ارتکازِ دولت کی مذمت کی اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ اس کو عام فلاحی کاموں میں خرچ کریں۔ ارشاد ہوا:

﴿وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّھَبَ وَالۡفِضَّۃَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَھَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡھُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۳۴﴾﴾ (التوبۃ)

''جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دو''

فرمایا:

﴿وَیۡلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ ﴿۱﴾ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ ﴿۲﴾ یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ ﴿۳﴾ کَلَّا لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَۃِ ﴿۴﴾﴾ (الھمزۃ)

''ہلاکت ہے ہر طعنہ زنی اور عیب چینی کرنے والے کے لیے، جس نے مال سمیٹا اور گن گن کر (تجوریوں میں) رکھا۔ اس کا گمان ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ رہے گا۔ ہرگز نہیں، ہڈیوں کو چٹخا دینے والی دوزخ میں اسے جھونک دیا جائے گا''

نیز فرمایا:

﴿مَاۤ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ مِنۡ اَھۡلِ الۡقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوۡلِ وَلِذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ﴾ (الحشر:۷)

''جو کچھ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے لوگوں سے دلوا دے وہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں اور غریبوں کا اور مسافروں کا' تا کہ جو تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔''

اسلام ہرگز ایسے معاشرے کی تشکیل نہیں کرتا جہاں دولت مخصوص ہاتھوں میں مرتکز رہے' وہ چاہتا ہے کہ دولت افراد کے درمیان گردش کرتی رہے' بلکہ یہ ضروری ہے کہ ہر ضرورت مند کی جائز ضرورتوں کی تکمیل ہوتی رہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''مؤمن وہ نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے مگر اس کا پڑوسی اس کے قرب میں بھوکا رہے''۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنی سواری کو ایک آبادی کی طرف موڑ رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اس زائد سواری کو اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو' اور جس کے پاس خوراک کا زائد ذخیرہ ہے وہ ایسے شخص کو دے دے جس کے پاس کھانے کو نہیں' حتیٰ کہ ہم یہ خیال کرنے لگے کہ ہم میں سے کسی کے پاس ضرورت سے زائد کوئی چیز نہیں''۔ (مسند احمد)

نادار' غریب اور مفلس لوگ بالعموم ہر معاشرے میں تضحیک کا نشانہ بنے ہوئے ہوتے ہیں' سکوں کی جھنکار میں کھوئے ہوئے لوگ اپنے کبر و غرور اور رعونت کے باعث ان کی تحقیر کرتے ہیں اور ان کی رائے کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے پیروکاروں پر قریش کے کھاتے پیتے لوگ ایسے ہی طعن توڑتے تھے کہ آپؐ کے گرد و پیش ہماری قوم کے غلام' موالی اور ادنیٰ طبقے کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ ان کی خستہ حالی کا مذاق اڑاتے تھے۔ قریش اور عرب کے سرداروں نے حضور ﷺ سے کہا: ''ہم تمہارے پاس کیسے آ کر بیٹھیں' تمہاری مجلس میں ہر وقت غریب' مفلس اور نچلے طبقے کے لوگ بیٹھے رہتے ہیں' ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹاؤ تو ہم آ کر بیٹھیں''۔ دراصل انہی غریب اور مفلس لوگوں نے سب سے پہلے اسلام کی دعوت قبول کی تھی۔ آپؐ ان کو لے کر حرم میں نماز پڑھنے جاتے تھے تو رؤسائے قریش ان کی ظاہری بے حیثیتی کو دیکھ کر استہزاء کرتے تھے: ''یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے؟'' مگر آپ ان کے اس مذاق کو برداشت کر لیتے تھے۔

ایک دفعہ تقاضائے بشریت سے آپؐ کے دل میں ایک خیال گزرا تو بارگاہِ احدیت سے

اس پر باز پرس ہوئی۔ دراصل ہوا یوں کہ حضورﷺ کے پاس قریش کے چند سردار بیٹھے تھے‘ آپؐ ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش فرما رہے تھے‘ عبداللہ بن اُمّ مکتوم‘ ایک نابینا صحابی‘ اتفاق سے ادھر آ نکلے اور اس مجلس میں آ کر بیٹھ گئے اور بات چیت کرنے لگے۔ رؤسائے قریش کو ان کا آنا ناگوار گزرا۔ حضورﷺ بھی عبداللہ بن اُمِّ مکتوم کو اپنے التفاتِ کریمانہ سے نواز نہ سکے۔ حضورﷺ کا خیال تھا کہ شاید یہ سردار اسلام کی دعوت کو قبول کر لیں اور ان بااثر لوگوں کی بدولت اسلام کی دعوت ذرا وسعت اختیار کر لے۔ مگر ایک غریب اور معذور صحابی سے یہ امتیاز اللہ کو پسند نہ آیا اور اس عدم التفات پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝١ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝٢ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝٣ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝٤ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝٥ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝٦ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝٨ وَهُوَ يَخْشٰى ۝٩ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝١٠ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝١١ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝١٢﴾ (عبس)

’’ترش رو ہوا اور بے رخی برتی‘ اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خبر کہ شاید وہ سدھر جائے‘ یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو۔ جو شخص بے پروائی برتتا ہے‘ اس کی طرف تم توجہ کرتے ہو‘ حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے‘ اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے‘ اس سے تم بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں یہ تو ایک نصیحت ہے‘ بس جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپؐ کے طرزِ عمل پر اس لیے بھی گرفت فرمائی گئی کہ داعیٔ حق کے پیشِ نظر یہ نکتہ بھی موجود رہے کہ وہ جاننے کی کوشش کرے کہ حقیقی معنوں میں طالب حق کون ہے۔ جو اس متاعِ گراں مایہ کا سرے سے قدردان ہی نہ ہو اس کو زیادہ اہمیت دینا مناسب نہیں۔ حق کی تشنگی رکھنے والے غریب و نادار زیادہ توجہ دیے جانے کے طالب ہیں۔

مسلمان امیر بھی تھے اور غریب بھی‘ دولت مند بھی اور فاقہ کش بھی‘ مگر حضورﷺ کا برتاؤ سب سے یکساں تھا۔ آپؐ غریبوں پر زیادہ شفقت فرماتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مزاج میں کسی قدر تعلّی تھی۔ ایک موقع پر آپؐ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: ((هَلْ تُرْزَقُوْنَ وَتُنْصَرُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ)) ’’تم کو جو نصرت اور روزی میسر آتی ہے وہ انہی

غریبوں کی بدولت آتی ہے''۔(مسند احمد)

عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مسجد نبویؐ میں بیٹھا تھا اور غریب مہاجر لوگ حلقہ باندھے ایک طرف بیٹھے تھے' اس اثنا میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور انہی کے ساتھ مل کر بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولت مندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے''۔ عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ ''میں نے دیکھا کہ یہ سن کر ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے اور مجھے حسرت ہوئی کہ کاش میں بھی انہیں میں ہوتا''۔(دارمی)

آنحضرت ﷺ اکثر دعا میں فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ))

''خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ' مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر!''

حضرت عائشہ ؓ نے دریافت فرمایا: ''یارسول اللہ یہ کیوں؟ فرمایا: ''اس لیے کہ یہ دولت مندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے''۔ پھر فرمایا: ''اے عائشہ! کسی مسکین کو اپنے دروازے سے نامراد نہ پھیرو' اگر چہ چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اے عائشہ! غریبوں سے محبت رکھو اور ان کو اپنے نزدیک کرو تو خدا بھی تم کو اپنے نزدیک کرے گا''۔(سنن الترمذی)

مسلمانوں سے جو زکوٰۃ وصول ہوتی تھی اس کی نسبت عام حکم تھا کہ ''ہر قبیلے کے یا ہر شہر کے امراء سے لے کر وہیں کے غرباء میں تقسیم کر دی جائے۔ صحابہ کرامؓ اس حکم کی شدت سے پابندی کرتے تھے۔ فقراء و مساکین کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ کسی طور پر ان کے دل آزردہ نہ ہوں۔ حضرت ابوبکر ؓ نے کسی بات پر حضرت سلمان اور حضرت بلال ؓ کو' جن کا شمار فقرائے مہاجرین میں ہے' ڈانٹا۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا: ''تم نے ان لوگوں کو آزردہ تو نہیں کیا؟'' یہ سن کر حضرت ابوبکر ؓ ان لوگوں کے پاس آئے اور معافی مانگی اور ان لوگوں نے معاف کیا۔ عوالی میں ایک عورت رہتی تھی' وہ بیمار پڑی۔ اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ خیال تھا کہ وہ آج کسی وقت مر جائے گی۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے کہا کہ وہ مر جائے تو میں جنازہ کی نماز خود پڑھاؤں گا' اس کے بعد دفن کی جائے۔ اتفاق سے اس نے کچھ رات گئے انتقال کیا' اس کا جنازہ جب تیار ہو کر لایا گیا تو آپؐ آرام فرما رہے تھے۔ صحابہؓ نے اس

وقت آپؐ کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور رات ہی کو دفن کر دیا۔ صبح کو آپؐ نے دریافت فرمایا تو لوگوں نے واقعہ عرض کیا' آپؐ یہ سن کر کھڑے ہو گئے اور صحابہؓ کو ساتھ لے کر دوبارہ اس کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔ (بخاری' بحوالہ سیرت النبی' جلد دوم از شبلی)

حضرت جریرؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم اللہ کے رسول ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک پورا قبیلہ مسافری کی حالت میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا' ان کی ظاہری حالت نادیدنی تھی' بدن پر کوئی کپڑا ثابت نہ تھا' برہنہ تن' برہنہ پا' کھالیں بدن سے بندھی ہوئیں' تلواریں گلوں میں پڑی ہوئیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ بے حد متاثر ہوئے' چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا' اضطراب کی حالت میں آپؐ اندر گئے' باہر آئے اور پھر حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ نماز کے بعد آپؐ نے خطبہ دیا اور تمام مسلمانوں کو ان کی امداد و اعانت کے لیے آمادہ کیا۔ (صحیح مسلم' بحوالہ سیرت النبی جلد دوم)

حضور نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے:

(( وَاللّٰهُ يُعْطِيْ وَاَنَا قَاسِمٌ ))

''اللہ پاک ہی عطا کرتا ہے اور میں تو بانٹنے کے لیے آیا ہوں''۔

ایک مرتبہ ایک شخص کے سوال پر آپؐ نے بکریوں کا ریوڑ کا ریوڑ اسے دے دیا جس پر قبیلے میں جا کر اس نے کہا: ''اسلام قبول کر لو۔ محمد (ﷺ) تو اتنے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی پروا بھی نہیں کرتے''۔ (صحیح بخاری)

## اخذ و استفادہ


(۱) تفہیم القرآن' جلد اوّل' پنجم' ششم
(۲) سیرت النبیؐ از شبلی نعمانی' حصہ دوم
(۳) نقوش' سیرت نمبر' حصہ چہارم
(۴) ماہنامہ فکر و نظر (سیرت نمبر)

تفہیم دین

# شریعت کی چار بنیادی اصطلاحات

حافظ طاہر اسلام عسکری

گزشتہ سے پیوستہ

## (۲) کفر

### ☆تعریف

لغت کی رو سے کفر ڈھانپنے اور چھپانے کو کہتے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں کفر ایمان کی ضد ہے' لہٰذا اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان نہ لانا کفر ہے خواہ اس کے ساتھ تکذیب شامل ہو یا نہ ہو۔ بلکہ شک وشبہ' اعراض' حسد' تکبر یا اتباع رسالت سے مانع خواہشاتِ نفس کی بنا پر بھی انسان کافر ہو جاتا ہے اور اگر اس کے ساتھ تکذیب بھی کرے تو یہ کفر میں اضافے کا سبب ہے۔ یہی حال اس شخص کا ہے جسے رسول کی صداقت کا یقین ہو' لیکن وہ حسد کی بنا پر اس کی تکذیب یا انکار کرے۔

### کفر کی اقسام

بنیادی طور پر کفر کی دو قسمیں ہیں:

(ا) پہلی قسم ''کفر اکبر'' ہے۔ یہ انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ پھر پانچ اقسام پر مشتمل ہے جو درج ذیل ہیں:

(ا) کفر تکذیب: اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ اَلَيْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ (العنکبوت)

''اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا جب سچی بات اس

تک پہنچے تو اس کو جھٹلائے! تو کیا ایسے کافروں کا ٹھکانہ دوزخ نہیں ہے؟''

(۲) کفر انکار و استکبار: اس کے ساتھ تصدیق بھی ہوتی ہے۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت اس کی دلیل ہے:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (البقرۃ)

''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔''

(۳) کفر ظن/شک: اس کی دلیل درج ذیل قرآنی آیات ہیں:

﴿وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾﴾ (الکھف)

''اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والا تھا' اور کہنے لگا میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی ویران ہوگا اور میرا نہیں خیال کہ قیامت آئے گی اور اگر مجھے اپنے مالک کی طرف جانا بھی پڑا تو وہاں لوٹ کر اس سے بھی بہتر (جائیداد) پاؤں گا۔ اس سے اس کے (مؤمن) ساتھی نے کہا اور وہ اس سے گفتگو کر رہا تھا' کیا تو اس خدا کا منکر ہو گیا ہے جس نے پہلے تجھے مٹی سے بنایا پھر نطفہ سے' پھر تجھے پورا مرد بنا دیا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ وہی اللہ میرا رب ہے اور میں اپنے مالک کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا۔''

(۴) کفر اعراض: اس کی دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾﴾ (الاحقاف)

''اور کافروں کو جس چیز سے ڈرایا جاتا ہے اس سے اعراض کرتے ہیں۔''

(۵) کفر نفاق: قرآن میں اس کی دلیل درج ذیل آیت ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۳﴾﴾ (المنٰفقون)

''یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے پھر کفر کیا تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی لہٰذا وہ سمجھتے نہیں۔''

(ب) کفر کی دوسری قسم ''کفر اصغر'' ہے۔اس سے انسان ملت اسلامیہ سے خارج نہیں ہوتا۔کفر اصغر کا تعلق عمل سے ہے۔اس سے مراد وہ گناہ ہیں جنہیں کتاب وسنت میں کفر کہا گیا ہے' لیکن یہ کفر اکبر کی حد کو نہیں پہنچتے۔مثلاً کفر نعمت' جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ ..... ﴾(النحل:۱۱۲)

''اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی' وہاں کے لوگ امن واطمینان سے رہتے تھے' ہر طرف سے ان کی روزی فراغت کے ساتھ چلی آتی تھی' پھر انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی.....''

اسی طرح مسلمان سے لڑائی اور غیر اللہ کی قسم کھانے کو بھی کفر کہا گیا ہے۔جیسا کہ درج ذیل احادیث نبویہ اس پر دلالت کرتی ہیں:

((سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ))(۱)

''مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔''

((لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ))(۲)

''میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔''

((مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ كَفَرَ اَوْ اَشْرَكَ))(۳)

''جس نے اللہ کے علاوہ کسی کی قسم اٹھائی اس نے کفر یا شرک کا ارتکاب کیا۔''

ان کے علاوہ بعض امور پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے' لیکن اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ گناہ کبیرہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو مؤمن قرار دیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى﴾ (البقرۃ:۱۷۸)

''اے ایمان والو! جو لوگ تم میں مار ڈالے جائیں' ان کا برابر کا بدلہ تم پر فرض ہے۔''

یہاں اللہ نے قاتل کو اہل ایمان سے خارج نہیں کیا' بلکہ اسے مقتول کے ولی کا بھائی کہا ہے:

﴿..... فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ﴾ (البقرۃ:۱۷۸)

''پس جس قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معافی دی جائے تو معاف کرنے والا دستور کے مطابق خون بہا وصول کرے اور قاتل اچھے طور سے وارث کو دیت ادا کرے۔''

اس آیت میں بلاشبہ اخوت دینی ہی مراد ہے۔ ایک اور مقام پر ہے:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا﴾ (الحُجُرٰت:۹)

''اور اگر دو مؤمن گروہوں کی آپس میں لڑائی ہو جائے تو ان میں صلح کرا دو۔''

یہاں لڑائی کرنے والے دونوں گروہوں کو مؤمن کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں جو مسلمان سے لڑائی کو کفر کہا گیا ہے تو اس سے مراد کفر اصغر ہے۔ اسی طرح جن دیگر افعال کو کفر کہا گیا ہے' اس کا مفہوم بھی یہی ہے۔

## کفر اکبر اور کفر اصغر میں فرق

نصوصِ شریعت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر کی مذکورہ دونوں قسموں میں درج ذیل اعتبارات سے فرق موجود ہے۔

(۱) کفر اکبر انسان کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیتا ہے' نیز اس سے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں' لیکن کفر اصغر سے نہ تو انسان دائرہ اسلام سے نکلتا ہے اور نہ ہی اس کے اعمال برباد ہوتے ہیں' البتہ اس کی کیفیت کے اعتبار سے اعمال میں نقص واقع ہو جاتا ہے اور اس کا مرتکب وعید کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

(۲) کفر اکبر کا مرتکب دائمی جہنمی ہے' مگر کفر اصغر کا ارتکاب کرنے والا اگر جہنم میں گیا بھی تو ہمیشہ کے لیے وہاں نہ رہے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ اپنی رحمت سے اسے جہنم میں داخل ہی نہ کرے۔

(۳) کفر اکبر سے انسان کا خون اور مال مباح ہو جاتا ہے' لیکن کفر اصغر سے ایسا نہیں ہوتا۔

(۴) کفر اکبر کے مرتکب سے دشمنی مؤمن پر واجب ہے۔ اہل ایمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ ایسے لوگوں سے دلی محبت رکھیں خواہ وہ ان کے انتہائی قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ جبکہ کفر اصغر دلی تعلق رکھنے کو بالکلیہ ممنوع نہیں کرتا' بلکہ کفر اصغر کے مرتکب سے اس کے ایمان کی نسبت سے دوستی اور نسبت کی جائے گی اور کفر و معصیت کی نسبت عداوت رکھی جائے گی۔

# (۳) نفاق

## ☆تعریف

نفاق 'نفق سے ہے۔ عربی میں نفق آر پار ہونے والے سوراخ یا سرنگ کو کہتے ہیں جس کے دونوں منہ کھلے ہوں۔ اسی سے قرآن میں ہے:

﴿فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ ......﴾ (الانعام:۳۵)

''پھر اگر طاقت ہوتو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالو۔''

عرب کہتے ہیں: نفق الیربوع یعنی ''جنگلی چوہیا اپنے بل کے دہانے سے داخل ہوکر دوسرے سے نکل گئی''۔ (٤)

شریعت میں نفاق کا مفہوم ہے: منہ سے اسلام اور بھلائی کا اظہار کرنا اور دل میں کفر وشر کو چھپا کر رکھنا۔ ایسے شخص کو منافق اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایک دروازے سے شریعت میں داخل ہوتا ہے اور دوسرے سے نکل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے درج ذیل ارشاد سے اسی پر متنبہ کیا ہے:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴿٦٧﴾﴾ (التوبة)

''بلاشبہ منافق ہی فاسق ہیں۔''

یعنی شریعت سے خارج ہیں' کیونکہ فسق کا معنی بھی نکلنے کا ہے۔ مزید برآں اللہ ربّ العزت نے منافقین کو کافروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے' جیسا کہ درج ذیل قرآنی آیت سے معلوم ہوتا ہے:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (النساء:١٤٥)

''بلاشبہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔''

نیز اللہ نے منافقوں کے بارے میں فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ﴾ (النساء:١٤٢)

''منافق (سمجھتے ہیں کہ وہ) اللہ کو فریب دیتے ہیں' حالانکہ (درحقیقت) اللہ ان کو فریب دے رہا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

يَشْعُرُوْنَ ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ (البقرۃ)

''منافق اللہ اور مؤمنوں کو دھوکہ دیتے ہیں' لیکن درحقیقت یہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن اس کا ادراک نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری میں اضافہ کر دیا' اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے' کیونکہ یہ جھوٹے ہیں۔''

## نفاق کی اقسام

نفاق کی دو قسمیں ہیں:

(۱) نفاقِ اعتقادی: یہ نفاق اکبر ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام کا زبانی طور پر اظہار کیا جائے اور باطن میں کفر ہو۔ اس سے انسان دین سے کلی طور پر خارج ہو جاتا ہے اور جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جا گرتا ہے۔ اللہ نے ان کی بہت سی بری صفات کا ذکر کیا ہے' مثلاً یہ کفر کرتے ہیں' دین اور اہل دین کا مذاق اڑاتے ہیں' ان کا میلان مکمل طور پر دشمنانِ دین کی طرف ہوتا ہے' کیونکہ اسلام دشمنی میں یہ بھی ان کے شریک ہوتے ہیں۔

ایسے لوگ ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔ جب اسلام کو قوت و شوکت اور غلبہ نصیب ہوا اور انہیں کھلم کھلا اسلام کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی تو اسلام اور مسلمانوں سے چال چلتے ہوئے یہ ظاہری طور پر مسلمان ہو گئے۔ اس سے ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ رہ سکیں اور ان کی جان و مال کو امان مل سکے۔ چنانچہ منافق ظاہراً تو اللہ' ملائکہ' کتب سماویہ' انبیاء اور یومِ آخرت پر ایمان لاتا ہے مگر دل سے ان کی تکذیب کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کے فریب کے پردے چاک کر دیے اور منافقوں کے کردار و نظریات کو بے نقاب کر دیا تاکہ مسلمان نفاق اور اہل نفاق سے بچ سکیں۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کے آغاز میں تین گروہوں کا ذکر کیا ہے' وہاں مؤمنوں کے بارے میں پانچ آیات' کافروں کے بارے میں دو اور منافقوں کے بارے میں تیرہ آیات نازل فرمائیں' کیونکہ یہ کثیر تعداد میں تھے اور اسلام و اہل اسلام کے لیے عظیم فتنہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسلام کو ان سے شدید خطرہ تھا اس لیے کہ بظاہر تو یہ اسلام کے نام لیوا تھے اور اس کی محبت و نصرت کا دم بھرتے تھے لیکن درحقیقت یہ اس کے دشمن تھے۔ یہ اپنی عداوت کو ہر اس طریقے سے ظاہر کرتے تھے جس سے جاہل سمجھتے کہ یہ تو علم و اصلاح کے علمبردار ہیں' حالانکہ یہ انتہا درجے کی جہالت اور فساد تھا۔

نفاق اعتقادی کی قسمیں: اس کی درج ذیل چھ صورتیں ہیں:

۱) تکذیبِ رسولؐ
۲) شریعت کے بعض حصے کو جھٹلانا۔
۳) رسول اکرم ﷺ سے بغض رکھنا۔
۴) شریعت محمدیؐ کے کچھ حصوں سے بغض رکھنا۔
۵) نبی کریم ﷺ کے دین کو نقصان پہنچنے پر خوشی اور اظہارِ مسرت کرنا۔
۶) دین محمد ﷺ کی مدد و نصرت کو ناپسند سمجھنا۔

(۲) نفاقِ عملی: نفاق کی دوسری قسم ''نفاقِ عملی'' ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان منافقوں جیسے بعض اعمال اپنا لے اگرچہ دل میں ایمان موجود ہو۔ یہ نفاق انسان کو ملت اسلامیہ سے خارج تو نہیں کرتا' لیکن اس کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ نفاقِ اصغر کے مرتکب شخص میں ایمان بھی ہوتا ہے اور نفاق بھی' لیکن جب نفاق زیادہ ہو جائے تو وہ خالص منافق بن جاتا ہے۔ اس کی دلیل رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ:

((اَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا: اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) (۵)

''جس شخص میں چار صفات ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک آدھ ہو اُس میں گویا نفاق کی ایک آدھ خصلت موجود ہے' یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ (۱) جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے (۲) بات کرے تو جھوٹ بولے (۳) وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے (۴) لڑائی جھگڑا ہو جائے تو گالی گلوچ کرے''۔

جس شخص میں یہ چار صفات جمع ہو جائیں اس میں گویا شر جمع ہو گیا اور منافقوں کی علامات اکٹھی ہو گئیں اور جس میں ایک آدھ خصلت پائی گئی' اس میں اسی قدر نفاق آ گیا۔ چنانچہ کبھی انسان میں خیر و شر یا ایمان اور کفر و نفاق جیسی صفات جمع ہو جاتی ہیں تو وہ اسی قدر ثواب و عذاب کا مستحق ٹھہرتا ہے جس تناسب سے یہ صفات اس میں موجود ہوتی ہیں۔ منافقین

کے اوصاف میں سے ایک وصف مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے میں کوتاہی اور سستی برتنا بھی ہے۔ نفاق ایسی خطرناک اور مہلک شے ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ڈرتے تھے کہ کہیں اس کا شکار نہ ہو جائیں۔ ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابہ کو دیکھا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے بارے میں نفاق سے خوف زدہ تھا۔

## نفاق اکبر اور نفاق اصغر میں فرق

نفاق کی دونوں قسموں میں درج ذیل پہلوؤں سے فرق پایا جاتا ہے:

(۱) نفاق اکبر انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے' لیکن نفاق اصغر ایسا نہیں کرتا۔

(۲) نفاق اکبر کا تعلق اعتقاد میں ظاہری وسری تضاد سے ہے' جبکہ نفاق اصغر عمل میں ظاہراً وسراً اختلاف سے متعلق ہے۔

(۳) نفاق اکبر کا صدور مؤمن سے نہیں ہوتا مگر نفاق اصغر مؤمن سے بھی ہو جاتا ہے۔

(۴) عام طور پر نفاق اکبر کا مرتکب توبہ نہیں کرتا اور اگر توبہ کر بھی لے تو حاکم کے سامنے اس کی توبہ کے قبول ہونے میں اختلاف ہے۔ اس کے برعکس نفاق اصغر کا ارتکاب کرنے والا توبہ کر لیتا ہے اور اللہ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔

نفاق اعتقادی کے مرتکبین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿١٨﴾﴾ (البقرة)

''یہ منافق بہرے ہیں' اندھے ہیں' گونگے ہیں' پس یہ لوٹ کر آنے والے نہیں۔''

یعنی وہ اپنے باطن میں اسلام کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ مزید فرمایا:

﴿اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿١٢٦﴾﴾ (التوبة)

''کیا یہ نہیں دیکھتے کہ انہیں سال میں ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالا جاتا ہے پھر بھی یہ توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''ایسے منافقوں کی ظاہری توبہ کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے کیونکہ اس کا صحیح علم نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تو ہمیشہ ہی اسلام کا اظہار کرتے ہیں۔''(۶)

# (۴) بدعت

''دین''، رسول اکرم ﷺ کی محبت واطاعت کا نام ہے۔محبت واطاعت کا مجموعہ اتباع کہلاتا ہے۔اتباعِ رسولؐ کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ انسان کسی بھی معاملے میں نبی مکرم ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ حضور نبی کریم ﷺ کے نقش قدم پر چلنے ہی کو سعادت سمجھے کہ یہی راہِ نجات ہے۔ جب اتباع کا یہ تصور آنکھوں سے اوجھل ہو جائے اور انسان نیکی کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے اسوہ کو پیش نظر رکھنے کے بجائے اپنی عقل وخرد سے نت نئے طریقے ایجاد کر کے خدا کی رضا پانا چاہے تو بدعت وجود میں آتی ہے، جو شریعت کی نگاہ میں شرک کے بعد سب سے بڑا جرم ہے، بلکہ ایک پہلو سے دیکھا جائے تو شرک ہی ہے، کیونکہ اس میں انسان خود شریعت سازی کا مرتکب ٹھہرتا ہے جو صرف اور صرف خدا تعالیٰ کا حق ہے۔

## ☆ بدعت کی لغوی تعریف

لغت میں بدعت 'البدع' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بغیر کسی مثال سابق کے کوئی شے گھڑ لینا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (البقرۃ:۱۱۷)

اس کا مطلب ہے: **مخترعهما على غير مثال سابق**، یعنی وہ زمین وآسمان کو بغیر کسی پہلے نمونے یا مثال کے ایجاد کرنے والا ہے۔اسی طرح قرآن حکیم میں ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا:

﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ .....﴾ (الاحقاف:۹)

اس کا مفہوم ہے:

**ما كنت اول من جاء بالرسالة من اللّٰه الى العباد بل تقدمنى كثير من الرسل**

یعنی ''میں کوئی پہلا شخص نہیں جو اللہ کی طرف سے انسانوں کے پاس پیغام لے کر آیا ہو، بلکہ مجھ سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں''۔

## ☆ بدعت کی اقسام

بنیادی طور پر بدعت کی دو قسمیں ہیں:

**(ا) ابتداع فی العادات (دُنیوی معاملات میں بدعت)**: اس سے مراد وہ ایجادات

ہیں جو ضروریاتِ زمانہ کے مطابق دنیا میں کی جاتی ہیں' جیسا کہ آج کل کی ایجادات ہیں۔ یہ جائز ہیں' کیونکہ عادات میں اصل اباحت ہے۔

(۲) ابتداع فی الدین: یہ حرام ہے' کیونکہ عبادات میں اصل یہ ہے کہ توقف اختیار کیا جائے جب تک شریعت سے کسی شے کا ثبوت نہ مل جائے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ))(۷)

''جو ہمارے دین میں ایسا طریقہ ایجاد کرے جو اس سے ثابت نہ ہو وہ مردود ہے''۔

دوسری روایت میں ہے:

((مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَیْسَ عَلَیْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ))(۸)

''جو کوئی ایسا عمل کرے جو ہمارا طریق کار نہیں وہ مردود ہے۔''

## ☆ بدعت کی اصطلاحی تعریف

علماء نے بدعت کی مختلف تعریفات کی ہیں جو اگرچہ لفظاً مختلف ہیں تاہم معنی کے اعتبار سے متفق ہیں۔ ان میں سے دو تعریفیں درج ذیل ہیں۔ علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں:

**البدعة طريقة فی الدين مخترعة تضاهی الشرعية يقصد بالسلوک عليها المبالغة فی التعبد للّٰه سبحانه وتعالیٰ**(۹)

''بدعت وہ طریقہ ہے جسے دین میں گھڑ لیا گیا ہو۔ یہ شرعی طریقے کے مشابہ ہوتا ہے اور اس پر عمل کرنے سے بدعتی کا مقصود اللہ کی عبادت میں مبالغہ کرنا ہوتا ہے''۔

علامہ ابن رجب حنبلیؒ کہتے ہیں:

**والمراد بالبدعة ما احدث مما لا اصل له فی الشريعة يدل عليه واما ما كان له اصل من الشرع بدل عليه فليس ببدعة شرعًا وان كان بدعة لغةً**(۱۰)

''بدعت وہ ہے جسے گھڑ لیا جائے اور شریعت میں کوئی ایسی دلیل موجود نہ ہو جو اس پر دلالت کرے۔ اگر شریعت میں اس کی کوئی دلیل موجود ہو تو وہ شرعاً بدعت نہ ہوگی اگرچہ لغوی طور پر اسے بدعت ہی کہا جائے''۔

## ☆ دینی بدعت کی اقسام

دین میں بدعت کی دو قسام ہیں:

(۱) قول و اعتقاد میں بدعت: جیسا کہ جہمیہ' معتزلہ' رافضہ اور دیگر گمراہ فرقوں کے اقوال و

عقائد ہیں، مثلاً قرآن مجید کے مخلوق ہونے کا عقیدہ وغیرہ۔

**(۲) عبادات میں بدعت**: یعنی ایسے طریقے سے اللہ کی عبادت کرنا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر نہیں کیا۔ اس کی کئی قسمیں ہیں:

پہلی قسم: ایسی بدعت جو اصل عبادت میں ہو، یعنی کوئی ایسی عبادت گھڑ لی جائے جس کا شریعت میں کوئی ثبوت موجود نہ ہو، مثلاً اپنی طرف سے کوئی نماز بنالینا، جیسا کہ ''نماز غوثیہ'' ہے جو بعض لوگوں کی ذاتی ایجاد ہے۔ اسی طرح اپنے پاس سے کوئی تہوار، میلہ یا عید مقرر کر لینا، جیسے عید میلاد النبی ﷺ ہے۔

دوسری قسم: شریعت سے ثابت شدہ کسی عبادت میں اضافہ کر لینا، مثلاً کوئی شخص ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھنا شروع کر دے۔

تیسری قسم: کسی عبادتِ مشروعہ کی ادائیگی کا ایسا طریقہ اپنا لینا جو شریعت سے ثابت نہ ہو، جیسا کہ بآوازِ بلند اجتماعی شکل میں مسنون اذکار اور دعائیں کی جائیں۔ اسی طرح عبادات میں اپنے آپ پر ایسی سختی بھی بدعت کی اس قسم میں شامل ہے جو سنت رسول سے متجاوز ہو۔

چوتھی قسم: عبادات میں بدعت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ کتاب وسنت سے ثابت شدہ کسی عبادت کا کوئی وقت مخصوص کر لیا جائے، جبکہ شریعت میں ایسی تخصیص موجود نہ ہو، مثلاً نصف شعبان کے دن کو روزے اور رات کو قیام کے لیے خاص کر لینا۔ روزہ اور قیام تو قرآن وسنت کی رو سے جائز ہیں لیکن اس وقت کی تخصیص محتاج دلیل ہے۔

## ☆ دینی بدعت کی تمام اقسام کا حکم

دین میں داخل کی جانے والی ہر بدعت حرام اور محض گمراہی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

((وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))(۱۱)

''خبردار! نئی نئی باتوں سے بچ کر رہنا، اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔

ایک اور روایت میں ہے:

((مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ)) (۱۲)

''جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا حکم نہیں تو وہ مردود ہے''۔

مذکورہ بالا دونوں احادیث اس امر کی دلیل ہیں کہ دین میں گھڑی جانے والی ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے' نیز رد کر دیے جانے کے قابل ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عبادات و اعتقادات میں بدعت کا حکم حرمت کا ہی ہے' لیکن یہ حرمت بدعت کی نوعیت کے مطابق ہوگی۔ چنانچہ:

..... بدعات میں سے کچھ تو صریح کفر ہیں' جیسا کہ قبروں میں مدفون لوگوں کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے ان کا طواف کرنا' اصحابِ قبور کے لیے جانور ذبح کرنا' ان کے لیے نذر ماننا' ان سے دعائیں مانگنا اور ان سے فریاد رسی چاہنا۔ اسی طرح غالی جہمیہ اور معتزلہ کے اقوال کا بھی یہی حکم ہے۔

..... بعض بدعات شرک تک پہنچانے کا وسیلہ و ذریعہ بنتی ہیں' جیسا کہ قبروں پر تعمیرات اور ان کے نزدیک نماز پڑھنا اور دعا مانگنا۔

..... کچھ بدعتیں ایسی ہیں جو فسق اعتقادی کے زمرے میں آتی ہیں' جیسا کہ کتاب و سنت کے برخلاف خوارج' قدریہ اور معتزلہ وغیرہ کے اقوال و عقائد ہیں۔

..... بعض بدعات معصیت کے درجہ تک ہی پہنچتی ہیں' مثلاً ترکِ دنیا' دھوپ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا' شہوت کے خاتمے کی نیت سے خصی ہو جانا وغیرہ۔

## بدعت کی حسنہ اور سیئہ میں تقسیم

بعض لوگ بدعت کو حسنہ اور سیئہ میں تقسیم کرتے ہیں' لیکن وہ غلطی پر ہیں' کیونکہ ان کا یہ نقطۂ نظر حدیث نبویؐ کے مخالف ہے۔ رسول مکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) یعنی ''ہر بدعت گمراہی ہے''۔

جبکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ساری بدعات گمراہی نہیں بلکہ بعض بدعات اچھی بھی ہوتی ہیں۔ حافظ ابن رجب حنبلیؒ فرماتے ہیں:

> ''رسول اکرم ﷺ کی حدیث ''کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ'' جوامع الکلم میں سے ہے' جس سے کوئی شے باہر نہیں۔ یہ اصولِ دین میں سے ایک عظیم اصل ہے۔ اسی سے ملتا جلتا رسول معظم ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے: ((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) پس جو شخص بھی دین میں کسی شے کا اضافہ کر کے اسے دین کی طرف منسوب کر دے اور دین میں اس کی کوئی اصل موجود نہ ہو تو وہ گمراہی ہے۔ برابر ہے کہ یہ ایجاد

اعتقاد وعمل کے مسائل میں ہو یا ظاہری و باطنی اقوال میں''۔(۱۳)

## ☆ بدعت حسنہ کی دلیل

بدعت حسنہ کے حق میں بنیادی طور پر جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے جو انہوں نے باجماعت تراویح کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ ''نِعْمَ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ''(۱۴) یعنی یہ اچھی بدعت ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسی کئی چیزیں دین میں نئی موجود ہیں جن کا سلف نے انکار نہیں کیا' مثلاً جمع قرآن اور تدوین حدیث وغیرہ۔

## تجزیہ

یہاں دراصل بدعت کی تقسیم کے قائلین غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان تمام امور کی اصل شریعت میں موجود ہے۔ رہا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول تو اس میں بدعت سے مراد بدعت لغوی ہے نہ کہ شرعی۔ اس لیے کہ جس شے کی اصل شریعت میں موجود ہو وہ بدعت شرعی نہیں ہوسکتی۔ بدعت شرعی کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کے لیے شریعت میں کوئی اصل موجود نہ ہو۔ 'جمع قرآن' کی شریعت میں دلیل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کتابت قرآن کا حکم دیتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس متفرق طور پر قرآن لکھا ہوا موجود تھا جسے انہوں نے جمع کر دیا۔ اسی طرح تراویح کی نماز خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی لیکن بعد میں فرضیت کے اندیشے سے آپ ؐ نے جماعت کرانا چھوڑ دی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چونکہ فرضیت کا خدشہ نہ رہا لہٰذا سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سہولت کے پیشِ نظر لوگوں کو ایک امام پر جمع کر دیا۔

جہاں تک کتابت وتدوین حدیث کا معاملہ ہے تو دین میں اس کی اصل بھی موجود ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرامؓ کے مطالبے پر حدیث لکھوائی۔ ایک روایت میں جو کتابت حدیث کی ممانعت آئی ہے تو اس کا پس منظر یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ قرآن اور حدیث کو ایک ہی جگہ لکھتے تھے' جس سے التباس کا خطرہ تھا۔ اس لیے فرمایا گیا کہ قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو' لیکن بعد میں اجازت دے دی جیسا کہ دیگر احادیث میں ہے۔ بعد ازاں علمائے محدثین نے حفاظت کے پیش نظر اس کو باقاعدہ مدون کر دیا۔ اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

## ☆ حرف آخر

اہل علم نے بدعت کو گناہ کبیرہ سے زیادہ خطرناک قرار دیا ہے' کیونکہ گناہگار کو تو توبہ

نصیب ہوسکتی ہے لیکن بدعتی اپنے آپ کو نیکی پر سمجھ رہا ہوتا ہے اس لیے اسے توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔ بے شمار احادیث رسول اور آثارِ صحابہ وتابعین میں بدعت واہل بدعت کی مذمت بیان ہوئی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں سنت واہل سنت سے محبت اور بدعت واہل بدعت سے براءت کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

## حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب خوف المؤمن من ان یحبط عمله وهو لا یشعر۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان قول النبی ﷺ سباب المسلم فسوق وقتاله کفر۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب الانصاف للعلماء۔وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان معنی قول النبی ﷺ لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب.....

(۳) سنن الترمذی، کتاب النذور والایمان عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فی کراهیة الحلف بغیر الله۔ حسنه وصححه الحاکم۔

(٤) مفردات القرآن لراغب الاصفهانی، ص ۱۰۷۳۔

(٥) صحیح البخاری، کتاب الایمان ،باب علامة المنافق۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال المنافق۔

(٦) مجموع الفتاویٰ ۳٤/٤۳٥۔

(۷) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب اذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود۔ وصحیح مسلم، کتاب الاقضیة، باب نقض الاحکام الباطلة ورد محدثات الامور۔

(۸) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب النجش ومن قال لا یجوز ذلك البیع۔ وصحیح مسلم، کتاب الاقضیة، باب نقض الاحکام الباطلة ورد محدثات الامور۔

(۹) الاعتصام للشاطبی ۱/۳۷۔

(۱۰) جامع العلوم والحکم لابن رجب ۲/۱۲۷۔

(۱۱) سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة۔

(۱۲) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب النجش ومن قال لا یجوز ذلك البیع۔ وصحیح مسلم، کتاب الاقضیة، باب نقض الاحکام الباطلة ورد محدثات الامور۔

(۱۳) جامع العلوم والحکم لابن رجب۔

(۱٤) صحیح البخاری، کتاب صلاة التراویح، باب فضل من قام رمضان۔

# کیا قتال فرضِ عین ہے؟

حافظ محمد زبیر ☆

دین اسلام امن وسلامتی کا دین ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دُنیا میں ظلم وستم کے خاتمے اور عدل وانصاف کے فروغ کے لیے ہمارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا ہے۔ دین اسلام کے تحت اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی احکامات دیے ہیں ان کی بنیاد نوعِ انسانی کی بھلائی اور فلاح وبہبود پر ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی جان کی حفاظت کے لیے قصاص کا قانون نازل فرمایا' نوعِ انسانی کے فروغ کے لیے نکاح کی ترغیب دلائی' انسان کے مال کی حفاظت کے لیے چوری اور ڈاکے وغیرہ کی حدود مقرر فرمائیں' انسان کے مال کی نشوونما کے لیے تجارت اور خرید وفروخت کو حلال ٹھہرایا' انسان کی عزت کی حفاظت کے لیے قذف کی حد کو مشروع قرار دیا اور اس کی عزت کے فروغ کے لیے اس کو والدین' عزیز واقارب' پڑوسی اور عام مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حقوق سے متعارف کروایا۔ انسان کی عقل کی حفاظت کے لیے شراب اور ہر نشہ آور چیز کو حرام قرار دیا' جبکہ اس کی عقل کی نشوونما کے لیے' **تفقه فی الدین**' کی فضیلت بیان کی۔ انسان کی نسل کی حفاظت کے لیے زنا کو حرام کہا تو اس کی نسل کے فروغ کے لیے نکاح کا حکم دیا۔ اسی طرح انسانی ضروریات میں سب سے بنیادی ضرورت جس کے بغیر انسان کے لیے زندگی گزارنا ناممکن ہے' یعنی دین' اس کی حفاظت اور ظلم واستحصال کے خاتمے کے لیے جہاد وقتال کو مشروع قرار دیا' جبکہ دین کے فروغ کے لیے دعوت وتبلیغ کا حکم دیا۔ غرضیکہ ہم اسلام کے کسی حکم پر بھی غور کریں تو ہم اس نتیجے تک پہنچیں گے کہ وہ انسان کی چھ بنیادی ضروریات یعنی دین' جان' عقل' نسل' مال اور عزت میں سے کسی نہ کسی ایک ضرورت کی حفاظت یا فروغ کے لیے ہوگا۔ جہاد وقتال شریعت اسلامیہ کی بنیادی اصطلاحات ہیں۔ سب سے پہلے ہم قرآن وسنت کی روشنی میں ان اصطلاحات کے شرعی معانی کی وضاحت کریں گے' اس کے بعد ہم اپنے اصل موضوع پر بحث کو آگے بڑھائیں گے۔

☆ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

## جہاد کا شرعی مفہوم

جہاد کا مادہ 'ج ہ د' ہے جس کے معنی مشقت اور طاقت کے ہیں ۔امام ابن فارسؒ لکھتے ہیں:

**جهد الجيم و الهاء و الدال اصله المشقة ثم يحمل عليه ما يقاربه يقال جهدت نفسي واجهدت والجُهد الطاقة قال اللّٰه تعالىٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ﴾**(۱)

''جهد' کا مادہ جیم' ہاء اور دال ہے ۔اس کا بنیادی معنی مشقت ہے' پھر اس لفظ کا استعمال اس معنی کے قریب کے الفاظ پر بھی ہونے لگا' جیسا کہ کہا جاتا ہے: میں نے اپنی جان کو مشقت میں ڈالا اور میں مشقت میں پڑا' جہد کا معنی طاقت بھی ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وہ لوگ اپنی طاقت کے سوا کچھ نہیں پاتے''۔

امام راغبؒ لکھتے ہیں:

**الجَهد والجُهد الطاقة والمشقة وقيل الجَهد بالفتح المشقة و الجُهد الوسع**(۲)

''جَهد اور جُهد طاقت اور مشقت کے معنی میں ہے' ایک قول یہ بھی ہے کہ 'جَہد' مشقت کے معنی میں اور 'جُہد' وسعت کے معنی میں ہے''۔

لفظ' جہاد' باب مفاعلہ سے مصدر ہے جس کے لغوی معنی باب مفاعلہ کی خصوصیتِ مشارکت کی وجہ سے کسی دوسرے کے خلاف اس حال میں مشقت اٹھانا اور اپنی طاقت خرچ کرنا ہوں گے جبکہ آپ کا مخالف بھی مشقت اٹھا رہا ہو اور آپ کے خلاف اپنی طاقت خرچ کر رہا ہو۔ کسی کے خلاف اپنی طاقت خرچ کرنے یا کوشش کرنے کی بیسیوں صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں' ان میں سے بعض صورتوں پر قرآن وسنت نے لفظ جہاد کا اطلاق کیا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ (الفرقان)

''پس آپ کافروں کی بات نہ مانیں اور ان کے ساتھ اس قرآن کے ذریعے بڑا جہاد کریں''۔

مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مکی ہے ۔اس آیت میں 'ہ' ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے ۔جمہور مفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما' مقاتل بن حیان' امام ابن جریر طبری' امام قرطبی' امام بغوی' امام بیضاوی' امام ابن تیمیہ' امام ابن کثیر' علامہ ابن جوزی' امام

عبد الرحمٰن الثعالبی، امام ابو جعفر النحاس، ابو لیث سمرقندی، امام نسفی، علامہ آلوسی، ابو الحسن الواحدی، شیخ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی، سید علامہ طنطاوی، شیخ ابن عجیبہ، علامہ زمخشری، امام ابو سعود، امام خازن، ابن عاشور، علامہ شنقیطی، جلال الدین محلی، سید قطب شہید، علامہ ابو بکر الجزائری رحمہم اللہ اور سعودی علماء کی جماعت نے (التفسیر المیسر میں) اس آیت مبارکہ میں 'ہ' ضمیر سے مراد قرآن لیا ہے۔ بعض مفسرین مثلاً امام رازی، ابن عادل حنبلی، امام بقاعی وغیرہ نے اس ضمیر سے اللہ کے رسول ﷺ کی تبلیغ رسالت میں جدوجہد وانتہائی کوشش مراد لی ہے۔ جبکہ بعض مفسرین نے اس ضمیر سے مراد اسلام لیا ہے۔ ان مفسرین کی آراء نقل کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ائمہ سلف کے نزدیک اس آیت میں جہاد سے مراد قتال نہیں ہے بلکہ یہ لفظ یہاں اپنی طاقت خرچ کرنے اور کوشش کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں ایک اور جگہ جہاد کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

(العنکبوت:۸)

''اور اگر وہ (والدین) تم سے جہاد کریں اس پر کہ تم میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ کہ جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، تو ان دونوں کی اطاعت نہ کرو''۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا یُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝۶﴾

(العنکبوت)

''اور جس نے جہاد کیا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے جہاد کرتا ہے۔ بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے''۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۶۹﴾

(العنکبوت)

''اور جن لوگوں نے ہمارے رستے میں جہاد کیا ہم انہیں اپنے رستے دکھائیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ ہر کام کو بخوبی انجام دینے والوں کے ساتھ ہے''۔

پس معلوم یہ ہوا کہ مکی سورتوں میں جہاد کا لفظ اپنی طاقت خرچ کرنے اور کوشش وجدوجہد

کرنے کے مفہوم میں بیان ہوا ہے' جبکہ مدنی سورتوں میں جہاد کا لفظ اپنے اس مکی دور کے معنی کے ساتھ ساتھ اضافی طور پر قتال کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔یعنی مدنی سورتوں میں جہاں بھی لفظِ جہاد آیا ہے اس سے مراد صرف قتال نہیں ہے اور نہ ہی اس سے مراد کفار کے خلاف صرف اپنی طاقت خرچ کرنا یا جدوجہد کرنا ہے' بلکہ اس سے مراد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں کے خلاف قتال اور ہر قسم کی طاقت خرچ کرنا اور جدوجہد کرنا ہے۔لہٰذا مدنی سورتوں میں جہاد کے معنی میں مکی سورتوں کا معنی ختم نہیں ہوا بلکہ مکی سورتوں کے معنی میں ایک اور معنی یعنی قتال کا اضافہ ہو گیا۔امام راغبؒ لکھتے ہیں:

**والجهاد والمجاهدة استفراغ الوسع فی مدافعة العدو والجهاد ثلاثة اضرب مجاهدة العدو الظاهر و مجاهدة الشيطان و مجاهدة النفس وتدخل ثلاثتها فی قوله تعالیٰ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ ﴿وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾**(۳)

''جہاد' اور 'مجاہدہ' سے مراد دشمن کو ہٹانے کے لیے پوری کوشش صرف کرنا ہے' اور جہاد تین قسم کا ہے۔ایک تو ظاہری دشمن سے جہاد ہے' دوسرا شیطان سے اور تیسرا اپنے نفس سے ہے اور یہ تینوں قسم کے جہاد قرآن کی ان آیات میں شامل ہیں 'اور تم اللہ کے راستے میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے' اور 'بے شک جو لوگ ایمان لے کر آئے اور انہوں نے ہجرت کی اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کے رستے میں جہاد کیا' اور 'تم اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کے رستے میں جہاد کرو'۔

قرآن کی درج ذیل آیت سے مذکورہ بالا بات اچھی طرح واضح ہو رہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ﴾

(التوبة:۷۳ و التحريم:۹)

''اے نبیؐ! آپ کافروں اور منافقین سے جہاد کریں وران پر سختی کریں''۔

اگر کوئی عالم اس موقف کو اختیار کریں کہ مدنی سورتوں میں جہاد کا لفظ صرف قتال کے معنی میں مستعمل ہے تو اس آیت کا مفہوم واضح نہیں ہوتا لیکن امام راغبؒ نے مدنی سورتوں میں جہاد

کا جو مفہوم بیان کیا ہے یعنی اسلام دشمنوں کے خلاف ہر قسم کی جدوجہد اور قتال، تو اس مفہوم کی روشنی میں اس آیت پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

**عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ فی قوله تعالیٰ ﴿جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ﴾ قال: بيده، فان لم يستطع فبلسانه، فان لم يستطع فبقلبه، فان لم يستطع فليكفهرّ فی وجهه**(٤)

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول 'کہ اے نبی ﷺ آپ کافروں ورمنافقین سے جہاد کریں' کا مطلب یہ ہے کہ ان سے ہاتھ سے جہاد کریں اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے جہاد کریں اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اپنے دل سے جہاد کریں اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اپنے چہرے پر کم از کم ناگواری کے تأثرات لے کر آئیں''۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں جہاد کو صرف قتال کے معنی میں لیا جائے جو کہ ناممکن ہے، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے منافقین سے قتال نہیں کیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس آیت میں جہاد سے اسلام دشمنوں کے خلاف صرف جدوجہد کرنا مراد لیا جائے، یہ بھی ناممکن ہے کیونکہ آپؐ نے کفار سے قتال بھی کیا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کفار کے لیے جہاد بالسیف یعنی قتال کا معنی لیا جائے اور منافقین کے لیے جہاد باللسان کا معنی لیا جائے۔ اس صورت میں جہاد کا معنی صرف قتال نہیں رہتا۔ اس رائے کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بیان کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس رائے کو مقاتل بن حیان، ربیع بن انس، مجاہد، سدی، امام بیضاوی، امام نسفی، امام سیوطی، جلال الدین محلی، ابوالحسن واحدی، ابولیث سمرقندی، ابن عطیہ، ابوجعفر النحاس، علامہ آلوسی، سید قطب شہید، ابن عجیبہ، اور علامہ ابوبکر الجزائری رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی اختیار کیا ہے۔

چوتھی اور آخری صورت یہ ہے کہ جہاد سے مراد جہاد بالید، جہاد باللسان اور جہاد بالقلب وغیرہ ہیں اور یہاں پر اللہ کے رسول ﷺ کو یہی حکم دیا جا رہا ہے کہ کافروں اور منافقین سے جہاد کریں اور کافروں کے ساتھ ساتھ منافقین سے یہ جہاد زبان اور دل کے علاوہ ہاتھ سے بھی ہوگا، اگر اس کی اہلیت مسلمانوں میں موجود ہوگی اور یہ قول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا

ہے۔ حضرت عبداللہ مسعود ؓ کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے رسول ﷺ کو حکم یہ ہے کہ کافروں اور منافقین سے ہر اس سطح پر جہاد کریں جس کی آپؐ کے پاس اہلیت ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی اس تفسیر کو امام طبری، امام رازی، ابن عادل حنبلی، ابن عبدالسلام، امام خازن، علامہ زمخشری، امام بن کثیر، امام شوکانی، امام بقاعی، علامہ سید طنطاوی، شیخ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی ؒ، اور التفسیر المیسر کے مؤلفین نے اختیار کیا ہے۔

اسی طرح جب ہم کتب احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر لفظِ جہاد، سنتِ رسول ﷺ میں بھی اسی معنی یعنی ہر قسم کی مشقت وجدوجہد اور قتال کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آپ ﷺ کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((مَامِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ، ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))[٥]

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ سے پہلے کسی قوم میں اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی نبی ایسا نہیں بھیجا کہ جس کے حواری اور ایسے ساتھی نہ ہوں جو کہ اس کے طریقے کے مطابق چلتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد کچھ ناخلف قسم کے لوگ ان کے جانشین بنتے تھے جو ایسی باتیں کہتے تھے کہ جن پر خود عمل نہیں کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے کہ جس پر عمل کرنے کا ان کو حکم نہیں دیا گیا تھا۔ پس جس نے ان کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے اور جس نے ان کے ساتھ اپنی زبان سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے اور جس نے ان کے ساتھ اپنے دل سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے۔ اور اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے''۔

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں:

((جَاهِدُوا الْمُشْرِكِيْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ))[٦]

''مشرکین کے ساتھ اپنی جانوں' اپنے مالوں اور اپنی زبانوں سے جہاد کرو''۔

اگر چہ بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ میں بھی جہاد کے لفظ کو قتال کے بغیر صرف مشقت اٹھانے اور جدوجہد کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ بعض روایات میں آپؐ نے حج اور عمرے کو عورتوں کا جہاد کہا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّهَا قَالَتْ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَرَى الْجِهَادَ أَفْضَلَ الْعَمَلِ أَفَلَا نُجَاهِدُ؟ قَالَ : ((لَا ' لٰكِنَّ اَفْضَلَ الْجِهَادِ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ))(۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا کہ ہم جہاد کو افضل ترین عمل سمجھتے ہیں' تو کیا ہم جہاد نہ کریں؟ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''نہیں' لیکن (تم عورتوں کے لیے) افضل جہاد حج مقبول ہے''۔

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ؟ قَالَ : ((نَعَمْ ' عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لَا قِتَالَ فِيْهِ ' اَلْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ) (۸)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا عورتوں پر بھی جہاد فرض ہے؟ آپؐ نے دریافت فرمایا: ''ہاں' ان پر جہاد فرض ہے لیکن اس میں قتال نہیں ہے اور وہ حج اور عمرہ ہے''۔

یہ روایت بھی اس مسئلے میں واضح ہے کہ قتال' جہاد کی ایک صورت ہے جبکہ جہاد کا لفظ عام ہے اور قتال اس کا ایک شعبہ ہے۔ بعض روایات میں والدین کی خدمت کو جہاد کہا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَاسْتَأْذَنَهُ فِي الْجِهَادِ' فَقَالَ : ((أَحَيٌّ وَالِدَاكَ؟)) قَالَ نَعَمْ ' قَالَ : ((فَفِيْهِمَا فَجَاهِدْ))(۹)

''ایک آدمی اللہ کے نبی ﷺ کے پاس آیا اور اس نے آپؐ سے جہاد پر جانے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے دریافت فرمایا: ''کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟'' تو اس نے کہا: جی ہاں' آپؐ نے فرمایا: ''پس ان دونوں میں جہاد کر''۔

بعض احادیث میں ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کو جہاد کہا گیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ))(۱۰)

''سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے انصاف کی بات کرنا ہے''۔

بعض احادیث میں اپنے نفس کو خواہشات اور اللہ کی معصیت سے روکنے کو جہاد کہا گیا ہے۔حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ : ((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ) (۱۱)

''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے''۔

ہمارے سلف صالحین بھی جہاد کا معنی صرف قتال نہیں لیتے تھے بلکہ ان کے نزدیک قتال' جہاد کا ایک جزو ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں 'کتاب الرقاق' کے تحت 'باب من جاهد نفسه فی طاعة اللّٰه' کے عنوان سے باقاعدہ باب باندھا ہے۔اسی طرح امام ترمذیؒ نے اپنی جامع میں 'کتاب الفتن عن رسول اللّٰه' کے تحت 'باب ما جاء أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر' کے عنوان سے باب باندھا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

شُدُّوا الرِّحَالَ فِی الْحَجِّ فَاِنَّهٗ أَحَدُ الْجِهَادَيْنِ(۱۲)

''حج کے لیے اپنے اونٹوں کے کجاوے کَس لو' کیونکہ یہ دو جہادوں میں سے ایک جہاد ہے''۔

مراد یہ ہے کہ کسی غزوے یا مہم سے لوٹنے کے بعد حج اور عمرہ کرو۔اسی طرح امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

الجهاد المكی بالعلم و البيان و الجهاد المدنی مع المكی بالید والحديد قال اللّٰه تَعَالٰی ﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲﴾ وسورة الفرقان مكية و انما جاهدهم باللسان و البيان(۱۳)

''مکی جہاد علم اور بیان کے ساتھ تھا جبکہ مدنی جہاد' مکی جہاد کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور تلوار کا جہاد بھی تھا' اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:''اور آپ کافروں کی بات نہ مانیں اور ان کے ساتھ اس کے ذریعے بڑا جہاد کریں''۔(الفرقان:۵۲) سورۃ الفرقان مکی ہے اور آپ نے مکہ میں مشرکین کے ساتھ زبان اور بیان کا جہاد کیا''۔

ابن بطالؒ لکھتے ہیں:

**جهاد المرء نفسه هو الجهاد الاكبر و حرب العدو الأضر...وقال علی بن أبی طالب أول ما تفقدون من دینکم جهاد أنفسکم**(۱٤)

''انسان کا اپنے نفس سے جہاد کرنا ہی جہاد اکبر اور سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے دشمن سے جنگ کرنا ہے...اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ سب سے پہلے تم اپنے دین میں جس چیز کو گم پاؤ گے وہ اپنے نفس سے جہاد ہے''۔

ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

**جهاد العدو الظاهر و هو جهاد الكفار وكذلک جهاد العدو الباطن و هو جهاد النفس والهوى فان جهادهما من أعظم الجهاد كما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي اللّٰهِ)) وقال عبد اللّٰه بن عمر لمن سأله عن الجهاد: ابدأ بنفسک فجاهدها' وابدأ بنفسک فاغزها' وقال بقية بن الوليد: أخبرنا ابراهيم بن أدهم قال: حدثنا الثقة عن علی بن أبی طالب' قال: أول ما تنكرون من جهادكم جهاد أنفسكم**(۱۵)

''ظاہری دشمن سے جہاد' کفار سے جہاد ہے اور باطنی دشمن سے جہاد' نفس اور اپنی خواہش سے جہاد ہے۔ بے شک ان دونوں کا جہاد سب سے بڑا جہاد ہے۔ جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''مجاہد تو وہ ہے جو کہ اللہ کے لیے اپنے نفس سے جہاد کرے''۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے کہا کہ جس نے آپ سے جہاد کے بارے میں سوال کیا تھا: اپنے نفس سے شروع کر اور اس سے جہاد کر' اور اپنے نفس سے شروع کر اور اس سے جنگ کر۔ بقیہ بن ولید نے کہا ہے کہ ہمیں ابراہیم بن اَدہم نے خبر دی اور انہوں نے کہا کہ ہمیں ایک ثقہ راوی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ''سب سے پہلے تم جس جہاد کا انکار کرو گے وہ تمہارا اپنے نفس سے جہاد کرنا ہے''۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

**قال بعض الأئمة : جهاد النفس داخل فی جهاد العدو' فان الأعداء ثلاثة : رأسهم الشيطان ثم النفس تدعو الى اللذات المفضية بصاحبها الى الوقوع فی الحرام الذی يسخط الرب و الشيطان هو المعين لها**

**علی ذلک و یزینه لها فمن خالف هوی نفسه قمع شیطانه فمجهادته نفسه حملهاعلی اتباع أوامر اللّٰه و اجتناب نواهیه و اذا قوی العبد علی ذلک سهل علیه جهاد أعداء الدین فالأول الجهاد الباطن و الثانی الجهاد الظاهر و جهاد النفس أربع : مراتب حملها علی تعلم أمور الدین ثم حملها علی العمل بذلک ثم حملها علی تعلیم من لا یعلم ثم الدعاء الی توحید اللّٰه وقتال من خالف دینه و جحد نعمهٗ**[16]

''بعض ائمہ کا کہنا ہے کہ نفس سے جہاد دشمن سے جہاد میں داخل ہے کیونکہ دشمن تین قسم کے ہیں۔ان میں سے بڑا شیطان ہے پھر وہ نفس ہے جو کہ ایسی لذات کی طرف انسان کو بلاتا ہے جو اس کے مرتکب کو ان حرام کاموں میں ڈال دیتی ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور شیطان اس کام میں نفس کا معاون ہوتا ہے اور اس کے لیے ان لذات کو مزین کرتا رہتا ہے۔پس جس نے اپنی خواہشات کی مخالفت کی اس نے اپنے شیطان کو دفع کر دیا اور اس کے اپنے نفس کے ساتھ مجاہدے نے اس کو اللہ کے احکامات پر عمل پیرا ہونے اور اس کے نواہی سے اجتناب کرنے کے لیے اس کو تیار کیا۔اور جب آدمی اس کا عادی ہو گیا تو اس کے لیے دین کے دشمنوں سے جہاد کرنا آسان ہو گیا۔ پہلا باطن کا جہاد ہے اور دوسرا ظاہر کا جہاد ہے اور نفس کے جہاد کے چار مراتب ہیں: پہلا مرتبہ نفس کو بنیادی دینی معاملات کے سیکھنے پر لگانا ہے' دوسرا مرحلہ اس کو ان معلومات پر عمل کرنے پر آمادہ کرنا ہے' تیسرا مرحلہ ان مسائل کو سیکھنا ہے جو اس کو معلوم نہیں ہیں جبکہ چوتھا مرحلہ اللہ کی توحید کی دعوت دینا اور اس شخص کے خلاف قتال کی طرف بلانا جس نے اللہ کے دین کی مخالفت کی اور اس کی نعمتوں کا انکار کیا''۔

ان حضرات کے علاوہ ائمہ سلف کی ایک بہت بڑی تعداد نے جہاد کو قتال کے علاوہ مشقت اٹھانے اور کوشش کرنے کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ ہمارا مقصود اس وقت ان علماء کی آراء کا احصاء نہیں ہے کہ جنہوں نے جہاد کو قتال کے علاوہ معانی میں بھی استعمال کیا ہے۔ہم اس بحث کے شروع میں ہی قرآن وسنت سے بات ثابت کر چکے ہیں کہ جہاد کا لفظ صرف قتال کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ قتال کے ساتھ ساتھ مشقت اٹھانا اور کوشش کرنا بھی اس کا شرعی مفہوم ہے' کیونکہ جس مفہوم میں جہاد کا لفظ قرآن وسنت میں استعمال ہوا ہے وہ اس کا شرعی مفہوم ہے۔اب یہ بحث کرنا کہ جہاد کا لغوی معنی تو مشقت اٹھانا اور کوشش کرنا ہے جبکہ اس

کا شرعی معنی قتال ہے' فضول بحث ہے۔ جب شریعت میں جہاد کے یہ دونوں معانی موجود ہیں تو دونوں ہی اس کے شرعی معنی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن منظور افریقیؒ اور اس کے بعض لغوییّن نے اپنی لغات میں جہاد کا معنی قتال بیان کیا ہے۔ اب اس وجہ سے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جہاد کا لغوی معنی قتال ہے کیونکہ لغت کی بعض کتابوں میں جہاد کا یہ معنی بیان ہوا ہے تو یہ بالکل غلط بات ہے۔ قرآن وسنت ہمارے لیے شریعت ہونے کے ساتھ ساتھ لغت کی کتاب بھی ہیں۔ جب قرآن وسنت میں جہاد کا لفظ صرف قتال کے معنی میں بیان نہیں ہوا تو پھر لغت کی کتابوں کے حوالے دے کر یہ ثابت کرنا کہ جہاد کا معنی صرف قتال ہے' بے بنیاد بحث ہے۔ علاوہ ازیں قرآن وسنت ان لغت کی کتابوں سے بہت مقدم ہیں کہ جو ان کے نزول سے سینکڑوں سال بعد لکھی گئیں۔ اس لیے اگر قرآن وسنت میں ایک مفہوم بیان ہو جائے تو اسی کا اعتبار ہوگا چاہے لغت کی کتابوں میں کچھ بھی لکھا ہو۔

خلاصۂ کلام یہی ہے کہ جہاد کا لفظ قرآن میں مکی سورتوں میں صرف مشقت اٹھانے اور کوشش کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور مکی جہاد قرآن کے ذریعے فرق باطلہ کے عقائد و نظریات کے خلاف علم و بیان کا جہاد تھا تاکہ اسلام دلیل و برھان کے میدان میں غالب ہو' جیسا کہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے۔ جبکہ مدنی سورتوں میں جہاد کا لفظ مشقت اٹھانے اور کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ قتال کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے' اور یہ دونوں جہاد کے شرعی معنی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ قرآن وسنت میں لفظ جہاد صرف قتال کے معنی میں کہیں بھی بیان نہیں ہوا جیسا کہ ہمارے ہاں جہادی تحریکوں نے جہاد بمعنی قتال کو عام کر رکھا ہے۔ جہاد کا شرعی مفہوم جاننے کے بعد اب ہم قتال کے شرعی معنی کی طرف آتے ہیں۔

## قتال کا شرعی مفہوم

قتال شریعتِ اسلامیہ کی اہم اصطلاح ہے۔ اس کا مادہ 'قتل' ہے۔ قرآن مجید میں یہ مادہ مختلف ابواب سے دو معانی میں استعمال ہوا ہے اس کا ایک معنی 'کسی کی جان لے لینا' یا 'کسی کو جان سے مار دینے' کے ہیں' جبکہ اس کا دوسرا معنی کسی پر 'لعنت کرنا یا اس کو ذلیل کرنا' ہے' جیسا کہ ابنِ فارسؒ نے 'معجم المقاییس' میں لکھا ہے۔ قرآن مجید' سنت رسول ﷺ اور اسلامی لٹریچر میں اس مادے سے آنے والے الفاظ کا معنی اکثر و بیشتر کسی کی جان لینا ہی ہوتا ہے' جبکہ دوسرے معنی میں یہ لفظ بہت کم استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾ (البقرة)

''اورتم ان لوگوں کومردہ نہ کہو جو کہ اللہ کے رستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اورلیکن تم شعورنہیں رکھتے''۔

ایک اورجگہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ ؕ﴾ (آل عمران:١٤٤)

''اور محمد ﷺ صرف اللہ کے رسول ہیں ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔کیا پس اگر وہ مرجائیں یا قتل کردیے جائیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے''۔

'قتال' باب مفاعلہ کا مصدر ہے اوراس باب میں خصوصیتِ مشارکت کی وجہ سے قتال کا معنی باہم ایک دوسرے کو قتل کرنا ہوگا' اس لیے 'قاتل عمرو زیدا' کا معنی ہوگا کہ زید نے عمرو سے اور عمرو نے زید سے لڑائی کی یعنی فعلِ قتل میں عمرو اور زید دونوں فاعل بھی ہیں اور مفعول بھی ہیں' اگرچہ جملے میں عمرو کو فاعل بنایا گیا اور زید کو مفعول' جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ قف﴾ (التوبة:١١١)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔وہ اللہ کے رستے میں قتال کرتے ہیں' پس وہ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''۔

اسی باب مفاعلہ سے یہ لفظ قرآن میں 'لعنت کرنے' کے معنی میں بھی آیا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰی يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾﴾ (التوبة)

''اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے وہ کہاں سے پھیرے جاتے ہیں''۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ' امام قرطبی' امام بغوی' امام خازن' علامہ سمرقندی' ابن عبدالسلام' امام واحدی' علامہ ابوبکر الجزائری رحمۃ اللہ علیہم نے اس آیت میں 'قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ' کا معنی 'لَعَنَهُمُ اللّٰه' کیا ہے' جبکہ امام رازی' امام بیضاوی' امام نسفی' علامہ زمخشری' ابن عطیہ' ابوحیان' امام شوکانی'

امام ابوسعود، ابن عجیبہ، سید قطب شہید، علامہ سید طنطاوی ؒ وغیرہ نے 'قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ' کا ترجمہ 'دَعَا عَلَيْهِمْ' (بدعا کرنا) کیا ہے اور ابن جریر طبریؒ نے 'قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ' کا معنی 'اَخْزَاهُمُ اللّٰهُ' (اللہ ان کو رسوا کرے) کیا ہے، جلال الدین محلی اور امام بقاعی نے 'قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ' کا ترجمہ 'اَهْلَكَهُمْ' (اللہ ان کو ہلاک کرے) کیا ہے۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ ۝﴾ (عبس)

''لعنت ہو انسان پر، کیسے اس نے اپنے رب کا کفر کیا''۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝﴾ (الذّٰریٰت)

''لعنت ہو اٹکل پچو کے تیر چلانے والوں پر''۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝﴾ (البروج)

''لعنت ہوں کھائیوں والوں پر''۔

یہ بات واضح رہے کہ 'قتال فی سبیل اللّٰہ' کا لفظ قرآن وسنت میں صرف جان لینے کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

## قتال کی شرعی حیثیت

قتال فرائض دینیہ میں سے ایک بنیادی فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں فقہاء نے جب ان پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں پر عائد کردہ فرائض میں بعض ایسے ہیں کہ جن کی ادائیگی کا مطالبہ اس نے ہر مسلمان سے کیا ہے اور یہ ایسے واجبات ہیں کہ ہر انسان میں اتنی اہلیت واستطاعت ہوتی ہے کہ وہ ان کو ادا کرسکتا ہے، جیسا کہ نماز ہے۔ ایسے فرض کو فقہاء نے فرض عین کہنا شروع کر دیا۔ جبکہ کچھ فرائض وواجبات ایسے تھے کہ جن کی ادائیگی فرد واحد سے ممکن نہ تھی لہٰذا ایسے فرائض میں اُمت مسلمہ کو مخاطب کر کے بحیثیت مجموعی اُمت پر ان فرائض کی ذمہ داری ڈالی گئی اور اُمت کو یہ پیغام دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ کام مطلوب ہے اور یہ کام ہونا چاہیئے، چاہے امت میں سے کوئی بھی کر دے جیسا کہ نماز جنازہ کی مثال ہے، ایسے فرائض وواجبات کو فقہاء نے فرضِ کفایہ کا نام دیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کی اصطلاحات فقہاء کی ایجادات ہیں' جبکہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانے میں یہ اصطلاحات موجود نہ تھیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فرائض دینیہ کی یہ تقسیم اور فرق کہ کچھ فرائض ایسے ہیں جن کی ادائیگی ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور کچھ فرائض ایسے ہیں جن کی ادائیگی اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے' اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی موجود تھا' لیکن اس فرق کا اظہار اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کے عمل سے تو ہوتا ہے لیکن ان تصورات کی ادائیگی کے لیے باقاعدہ کوئی اصطلاحات ابھی تک وضع نہیں ہوئی تھیں۔ فقہاء نے انہی تصورات کو' جو کہ خیر القرون میں رائج تھے' اصطلاحات کا جامہ پہنا دیا۔ لہٰذا فرائضِ دینیہ کی یہ تقسیم کوئی بدعت نہیں ہے' جیسا کہ بعض ناواقف لوگوں کا خیال ہے۔ قرآن وسنت کی نصوص اور ائمہ سلف کی آراء اس مسئلے میں بالکل واضح ہیں کہ قتال اصلاً فرض کفایہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾ (النساء)

''اہل ایمان میں سے بغیر کسی عذر کے بیٹھے رہنے والے اور اللہ کے رستے میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو گھر بیٹھے رہنے والوں پر ایک درجہ فضیلت بخشی ہے اور ان میں سے ہر ایک گروہ (یعنی جہاد کرنے والے اور گھر میں بیٹھے رہنے والے) سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو گھر بیٹھے رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کے اعتبار سے فضیلت عطا کی ہے''۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ﴾

(النساء: ٨٤)

''آپؐ اللہ کے رستے میں قتال کریں' آپؐ کو صرف آپؐ کی جان کا مکلّف بنایا گیا ہے اور اہل ایمان کو (قتال کے لیے) ابھاریں''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے راویت ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((وَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَصَامَ رَمَضَانَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ جَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ جَلَسَ فِيْ اَرْضِهِ الَّتِيْ وُلِدَ فِيْهَا)) فَقَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُبَشِّرُ النَّاسَ؟ قَالَ : ((اِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ أَعَدَّهَا اللّٰهُ لِلْمُجَاهِدِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا بَيْنَ الدَّرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ، فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْئَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ فَاِنَّهُ اَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَأَعْلَى الْجَنَّةِ اَرَاهُ فَوْقَهُ عَرْشَ الرَّحْمٰنِ وَمِنْهُ تَفْجُرُ اَنْهَارَ الْجَنَّةِ))(۱۷)

''اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے: اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لایا اور نماز قائم کی اور اس نے رمضان کے روزے رکھے تو اللہ کے ذمے یہ لازم ہے کہ اس کو جنت میں داخل کرے، چاہے اس نے اللہ کے رستے میں جہاد کیا ہو یا وہ اپنی اس سرزمین میں بیٹھا رہا ہو کہ جس میں وہ پیدا ہوا ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم لوگوں کو خوشخبری نہ دے دیں؟ تو آپؐ نے فرمایا: جنت میں ایک سو درجے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لیے تیار کر رکھا ہے اور جنت کے دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ زمین اور آسمان کے درمیان ہے، پس جب تم اللہ سے جنت کا سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا بہترین اور اعلیٰ حصہ ہے، میں اس کے اوپر رحمٰن کا عرش دیکھتا ہوں اور اسی سے جنت کی تمام نہریں پھوٹتی ہیں''۔

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں:

((لَا تَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَسَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ، فَاِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ))(۱۸)

''دشمن سے ملاقات کی خواہش نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرو پس جب تمہارا دشمن سے آمنا سامنا ہو جائے تو ڈٹے رہو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے''۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

اَتٰى رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ جِئْتُ اُرِيْدُ الْجِهَادَ

مَعَکَ اَبْتَغِیْ وَجْهَ اللّٰهِ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَقَدْ اَتَیْتُ وَاِنَّ وَالِدَیَّ لَیَبْکِیَانِ، قَالَ: ((فَارْجِعْ اِلَیْهِمَا فَأَضْحِکْهُمَا کَمَا اَبْکَیْتَهُمَا))(۱۹)

''ایک آدمی اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں جہاد کرنے کے لیے آپؐ کے پاس آیا ہوں تاکہ اللہ کی رضا اور آخرت کا گھر حاصل کر سکوں اور میں اپنے والدین کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ رو رہے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ ان کی طرف لوٹ جا! پس ان کو ہنسا جس طرح کہ تو نے ان کو رُلایا ہے''۔

مذکورہ بالا نصوص کی بنیاد پر ائمہ سلف کا اس مسئلے میں تقریباً اتفاق ہے کہ قتال اصلاً فرضِ کفایہ ہے' لیکن بعض حالات میں بعض اشخاص پر فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عصرِ حاضر میں بعض مقاتلین ایسے بھی ہیں جو کہ قتال کو اصلاً فرضِ عین سمجھتے ہیں اور اس کے لیے وہ اہل الظاہر کی طرح قرآن وسنت کی ظاہری نصوص سے بغیر کسی تفقہ وتدبر کے استدلال کرتے رہتے ہیں۔ راقم الحروف کو ایک دفعہ کشمیر میں برسرِ پیکار ایک جہادی تحریک کے اعلیٰ عہدیدار کا اس مسئلے پر درس سننے کا اتفاق ہوا کہ قتال فرضِ عین ہے یا نہیں؟ وہ صاحب اس بات پر بضد تھے کہ قتال فرضِ عین ہے اور اس کے لیے ان کے پاس دلیل یہ تھی کہ جیسے 'کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ' سے تم روزے کی فرضیت نکالتے ہو اسی طرح کی قتال کی فرضیت 'کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ' سے نکلتی ہے کیونکہ دونوں کے لیے ایک ہی جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ حالانکہ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے فرض کی نوعیت ایسی ہے کہ ہر مسلمان اس کو ادا کر سکتا ہے اس لیے یہ ہر مسلمان پر فرض قرار دیا گیا جیسا کہ اور بہت سی نصوص سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ روزہ ہر مسلمان پر فرض ہے' جبکہ اکیلا مسلمان قتال کی اہلیت نہیں رکھتا اور اس کی ادائیگی ایک باقاعدہ قوت رکھنے والی منظّم جماعت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے قتال کو فقہاء نے فرضِ کفایہ قرار دیا ہے۔ اس کی سادہ سی مثال قرآن ہی کی ایک دوسری آیت 'کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ' ہے۔ اب اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کوئی مسلمان قتل ہو جائے تو ہر انسان پر قصاص لینا فرضِ عین ہے۔ اگر اس سے یہ مراد لی جائے گی تو ایک مسلمان معاشرہ باہمی قتل و غارت وفتنہ وفساد کا شکار ہو جائے گا' لہٰذا اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم 'کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ' اور 'کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ' میں فرق کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دونوں فرائض ہیں اور فرض کفایہ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اس کا درجہ فرضیت میں فرض عین

سے کم ہے بلکہ فرضِ عین ہو یا فرضِ کفایہ‘ فرضیت اور اہمیت کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں اگرچہ مخاطبین کے اعتبار سے ان میں فرق ہے۔ فرض عین کا مخاطب عین (ذات) ہوتی ہے جبکہ فرض کفایہ میں خطاب ایک اجتماعیت سے ہوتا ہے۔ فرض کفایہ شروع ہی سے امت کے ایک خاص طبقے کے لیے فرض عین ہوتا ہے یا بعض مخصوص حالات میں امت کے بعض ایسے افراد کے لیے فرضِ عین ہو جاتا ہے جو کہ اس کو ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں‘ جبکہ باقی اُمت کے لیے وہ فرضِ کفایہ ہی رہتا ہے۔

عام طور پر جہادی تحریکوں نے یہ غلط فہمی بھی پھیلا رکھی ہے کہ قتال تو اُمت کے لیے فرض کفایہ ہے‘ لیکن بعض حالات میں یہ ہر ہر فرد کے لیے فرضِ عین ہو جاتا ہے‘ اس لیے اب حالات ایسے ہیں کہ قتال امت کے ہر ہر فرد پر فرضِ عین ہو گیا ہے۔ اس کے لیے عموماً غزوۂ تبوک کے واقعہ سے دلیل پکڑی جاتی ہے کہ اس غزوے کے موقع پر قتال پوری امت پر فرض عین ہو گیا تھا۔ یہ بات درست نہیں ہے‘ اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں قتال اُمت کے ہر ہر فرد پر کبھی بھی فرض نہیں ہوا‘ اور غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل شدہ آیات تو اس مسئلے میں نص صریح ہیں کہ حالات چاہے کچھ بھی ہوں‘ قتال اُمت کے ایک ایک فرد پر فرض عین کبھی بھی نہیں ہوتا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر بھی قتال اُمت کے صرف اس خاص طبقے کے لیے فرض عین تھا کہ جس پر شارع نے اس کو متعین طور پر فرض ٹھہرایا تھا‘ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۖ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾﴾ (التوبة)

’’نہیں ہے کمزور لوگوں پر کوئی گناہ اور ان لوگوں پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے جو کہ مریض ہیں اور ان لوگوں پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے جو کہ خرچ نہیں پاتے جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خیر خواہ ہوں‘ ہر کام کو بخوبی انجام دینے والوں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے‘ اور نہ ان لوگوں پر کوئی گناہ ہے جو کہ آپ کے پاس آئے تاکہ آپ ان کو کسی سواری پر سوار کریں تو آپ ان کو کہتے ہیں میں کوئی ایسی

چیز نہیں پاتا جس پر تم کو سوار کروں' وہ پھر جاتے ہیں اس حال میں کہ ان کی آنکھیں غم کی وجہ سے آنسو بہا رہی ہوتی ہیں کہ وہ ایسی چیز نہیں پاتے کہ جس کو وہ خرچ کر سکیں''۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ عورتوں پر قتال غزوۂ تبوک کے موقع پر نفیرِ عام کے باوجود بھی فرضِ عین نہیں تھا' حالانکہ اس دور میں عورتیں نہ صرف قتال کی اہلیت رکھتی تھیں بلکہ بالفعل کئی غزوات میں شریک بھی ہوتی تھیں اور ان میں میدان جنگ میں اسلام کے دشمنوں سے لڑنے کا جذبہ بھی بدرجۂ اَتم موجود تھا جیسا کہ بعض روایات کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے' اس سب کے ہوتے ہوئے بھی ان پر قتال فرض نہیں کیا گیا۔ اسی طرح وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہ جن میں قتال کی اہلیت نہیں تھی یعنی بوڑھے اور مریض' ان پر بھی قتال فرض نہیں کیا گیا' علاوہ ازیں وہ صحابہؓ کہ جن میں قتال کی اہلیت وقدرت تو تھی لیکن ان کے پاس قتال کے اسباب و ذرائع یعنی کوئی سواری یا رستے کا خرچ نہیں تھا تو ان کو بھی مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں قتال کی فرضیت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ لہٰذا غزوۂ تبوک کے موقع پر اس غزوے میں شامل نہ ہونے والے افراد کے چار قسم کے گروہ ہیں: ایک گروہ تو وہ تھا کہ جس پر قتال شروع ہی سے فرض نہیں تھا اور یہ عورتوں کا گروہ تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا کہ جس کو قتال سے اس لیے مستثنیٰ قرار دیا گیا کہ ان میں قتال کی اہلیت وقدرت نہیں تھی جیسا کہ مریض اور بوڑھے صحابہؓ تھے۔ تیسرا گروہ وہ تھا کہ جن میں قتال کی اہلیت تو تھی لیکن اسباب و ذرائع کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان پر قتال فرض نہ ہوا۔ چوتھا گروہ وہ تھا کہ جس میں قتال کی اہلیت بھی تھی اور اس پر وہ فرض بھی تھا اور اس کے پاس اس فرض کی ادائیگی کے ذرائع و وسائل بھی موجود تھے' لیکن اس کے باوجود وہ غزوۂ تبوک میں نفیرِ عام کے بعد بھی شریک نہ ہوئے تو ان کا مؤاخذہ کیا گیا' جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ یَسۡتَاۡذِنُوۡنَکَ وَہُمۡ اَغۡنِیَآءُ رَضُوۡا بِاَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَوَالِفِ ۚ وَطَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۳﴾﴾ (التوبۃ)

''راہِ الزام تو صرف انہی لوگوں پر ہے جو آپ سے غنی ہونے کے باوجود اجازت طلب کرتے ہیں' وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ پیچھے رہ جانے والیوں کے ساتھ ہو جائیں' اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دل پر مہر لگا دی ہے پس وہ نہیں جانتے''۔

لہٰذا ہر فرض کفایہ اُمت کے اس خاص طبقے کے لیے' خاص حالات میں فرضِ عین ہوتا ہے جو اس کی ادائیگی کی اہلیت اور اسباب و ذرائع رکھتا ہے' جبکہ باقی تمام اُمت کے اعتبار سے یہ فرض

کفایہ ہوتا ہے۔ یہی معاملہ قتال کا بھی ہے۔قتال فرضِ عین ہے' لیکن کس پر؟اس جماعت پر جو اس کی اہلیت اوراسباب وذرائع رکھتی ہے۔اور جواس کی اہلیت اوراسباب وذرائع نہیں رکھتااس پرفرض یہ ہے کہ وہ اس کوقتال پر مجبور کرے جو کہ اس کی اہلیت اوراسباب وذرائع رکھتا ہے۔ ہر دور میں قتال کی مکمل اہلیت واستطاعت اوراسباب وذرائع کسی بھی خطے میں مسلمانوں کی حکمران جماعت کے پاس ہوتے ہیں'اس لیے احادیث میں قتال کے لیےعموماً امیر المؤمنین یا خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں قتال کا تذکرہ ملتا ہے' لیکن بعض اوقات صورت حال یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے کسی خطے میں مسلمان حکمران کے عیش وعشرت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اسلامی سلطنت کافروں کے ہاتھ چلی جاتی ہےتوان کافرحکمرانوں سے اس خطۂ ارضی کو بازیاب کروانا اوراس کے رہائشی مسلمانوں کوآزاد کروانا تمام اُمت مسلمہ پرفرض ہےاور جس میں بھی اس فرض کی ادائیگی کی اہلیت اوراسباب وذرائع ہوں گےاس کے لیے یہ فرض'فرضِ عین ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے دشمنوں سے مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں کو بازیاب کروانے یا کسی کمزوراسلامی سلطنت کی حفاظت کے لیے ریاست کے امیر کے بغیر قتال یا چھاپہ مارکارروائیاں بھی شرعاًاور مصلحتاً جائز ہیں' کیونکہ خیرالقرون اوراس کے مابعد کے زمانوں میں کئی صدیوں تک آلات حرب'جنگی قوت'لڑائی کے انداز وتدابیر تقریباً ایک ہی جیسی تھیں'اس لیے اگرمسلمانوں کی کوئی سرزمین کافروں کے پاس چلی جاتی تھی تواس وقت اُمت کے اولوالالباب'عام مسلمانوں کوکافرحکمران کےظلم وستم سے بچانے کے لیےکسی مسلمان حکمران کی امارت واجازت کے بغیر بھی قتال کرلیتے تھےاورفقہائے اُمت اس کی تائید کے لیے فتاویٰ بھی جاری کردیتے تھے۔لیکن آج ہم سائنسی ایجادات'ٹیکنالوجی کی ترقی اورعمرانی علوم کے ارتقاء سے گزرنے کے بعدجن معاشروں میں زندگی گزاررہے ہیں ان کے حالات ان معاشروں سے بہت مختلف ہیں جن میں ہمارے سلف صالحین یا متقدمین فقہاء ہوگزرے ہیں۔انیسویں صدی عیسوی تک تو عددی قوت اورافراد کی جنگی تربیت کسی بھی معرکے میں فتح کے لیے بنیادی کردارادا کرتی تھی لیکن عصرحاضر میں جنگ کا میدان'طریقہ کار'انداز' آلات اورتدابیرسب کچھ بدل چکا ہے آج میزائل ٹیکنالوجی'فضائیہ'نیوی' آرٹلری اور جاسوسی کے جدیدترین آلات اورنیٹ ورکس جنگ میں فیصلہ کن کردارادا کرتے ہیں اوراس سطح پرقتال کی تیاری ریاست کے ذریعے ہی ممکن ہے۔اس لیے ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قتال کی اہلیت اوراسباب وذرائع عصر

حاضر میں افراد یا کسی محدود جہادی تحریک کے پاس نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ اہلیت عصر حاضر میں مسلمان ریاستوں کے پاس منتقل ہو چکی ہے اس لیے مسلمان ریاستوں کے سربراہوں اور حکومتوں پر، کشمیر ہو یا فلسطین، افغانستان ہو یا عراق، ہر جگہ مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم کے خاتمے اور ان کی آزادی کے لیے قتال، فرضِ عین ہے، جبکہ عامۃ الناس پر فرضِ عین یہ ہے کہ وہ اپنی ریاستوں کے سربراہان اور حکومتوں کو اس فرض کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لیے ہر پرامن اور جائز ذریعے سے دباؤ ڈالیں۔ ان کو اس فریضے کی ادائیگی پر کھڑا کرنے کے لیے جلسے جلوس کریں، سیمینار منعقد کریں، دھرنے دیں، عوامی تحریکیں چلائیں، عوام الناس کو سڑکوں پر لائیں، لوگوں کی ذہن سازی کریں وغیرہ۔ لیکن یہ تمام کام پرامن جدوجہد کے ذریعے اور بغیر کسی تشدد، فتنہ وفساد اور توڑ پھوڑ کے ہونے چاہئیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس سب کے باوجود بھی اگر حکمران قتال کے فریضے کی ادائیگی کے لیے تیار نہ ہوں تو پھر کیا اس فریضے کی ادائیگی کے لیے اپنے طور پر کچھ افراد مل کر کوئی جماعت بنا کر یہ کام کر سکتے ہیں؟ تو ہمارا مطلق جواب نفی میں ہے۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ قصاص لینا یا حدود اللہ کا نفاذ حکمرانوں پر فرضِ عین ہے جبکہ امت پر فرضِ کفایہ ہے، لیکن اگر کوئی حکمران اس فرض کی ادائیگی نہیں کر رہا تو کون سا عالم ایسا ہے جو یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ایسی صورت میں اس ملک کے باشندے قانون اپنے ہاتھ میں لے کر قصاص لینا شروع کر دیں اور لوگوں پر شراب، چوری، رجم اور زنا کی حدود کو نافذ کرنا شروع کر دیں؟ اگر کسی مسلمان ریاست میں حکمران حدود اللہ یا اللہ کے احکامات کے مطابق فیصلے نہیں کر رہے، جیسا کہ عصر حاضر میں تقریباً تمام اسلامی ریاستوں کا یہی حال ہے، تو ایسی صورت میں عامۃ الناس کے ایک طبقے کے لیے یہ بالکل بھی جائز نہیں ہے کہ وہ ایک جماعت بنا کر خود ہی لوگوں کو قصاص کے نام پر قتل کرنا شروع کر دیں، بلکہ عوام الناس کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ہر ممکن صورت کو بروئے کار لاتے ہوئے حکمرانوں کو ان کے فرض کی ادائیگی کی طرف توجہ دلاتے رہیں یا پھر عوام الناس پر امن آئینی، قانونی، سیاسی یا انقلابی منظم جدوجہد کے ذریعے ایسے ظالم، فاسق وفاجر حکمرانوں سے نجات حاصل کر کے دیندار، صالح اور امامت کے اہل افراد کو اس منصب پر فائز کریں تاکہ اس دیندار حکمران کی قیادت میں ریاست کی سطح پر قتال کے فریضے کو سرانجام دیا جائے۔ ہمارا مقید جواب یہ ہے کہ ہم مسلمان ریاستوں کے حکمرانوں کے فریضۂ قتال کو ادا نہ کرنے کی صورت

1

میں قتال کو ساقط نہیں سمجھتے لیکن ہم عوامی جہادی تحریکوں کے لیے قتال کے منہج کو اس صورت میں درست سمجھتے ہیں جبکہ وہ قتال کے لیے اس قدر اہلیت و استطاعت اور اسباب و ذرائع رکھتی ہوں جو کہ ایک ریاست کی حکومتی مشینری کے پاس ہوتے ہیں یا جن سے کافروں کی ذلت و رسوائی اور مسلمانوں کی فتح و غلبے کے امکانات قوی تر ہوں۔ اپنے اس مقید جواب سے متعلق مفصل بحث ہم اِن شاء اللہ اس مضمون کی آئندہ قسط میں کریں گے۔

(جاری ہے)

## حواشی

(١) معجم المقاييس فی اللغة : باب ج' ہ' د۔

(٢) المفردات : باب ج' ہ' د ۔

(٣) المفردات : باب ج'ہ'د ۔

(٤) تفسیر طبری : التوبہ : ٧٣۔

(٥) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان۔

(٦) سنن ابی داؤد' کتاب الجهاد' باب کراهية ترك الغزو۔

(٧) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب فضل الحج المبرور۔

(٨) سنن ابن ماجة' کتاب المناسك' باب الحج جهاد النساء۔

(٩) صحیح البخاری' کتاب الجهاد و السیر' باب الجهاد باذن الأبوین۔

(١٠) سنن ابن ماجه' کتاب الفتن' باب الأمر بالمعروف والنهی عن المنکر۔

(١١) سنن الترمذی' کتاب فضائل الجهاد عن رسول اللّٰه' باب ما جاء فی فضل من مات مرابطا ۔

(١٢) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب الحج علی الرحل۔

(١٣) مجموع الفتاوی: رسالة من شیخ الاسلام الی أصحابه و هو فی حبس الاسکندرية۔

(١٤) صحیح البخاری مع شرح ابن بطال' کتاب الرقاق' باب من جاهد نفسه فی طاعة اللّٰه۔

(١٥) جامع العلوم وا لحکم : باب الحدیث التاسع عشر۔

(١٦) صحیح البخاری مع فتح الباری' کتاب الرقاق' باب من جاهد نفسه فی طاعة اللّٰه۔

(١٧) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب درجات المجاهدین فی سبیل اللّٰه۔

(١٨) صحیح البخاری' کتاب الجهاد و السیر' باب لا تمنوا لقاء العدو۔

(١٩) سنن ابن ماجة' کتاب الجهاد' باب الرجل یغزو وله ابوان۔

# علامہ اقبال مسجد قرطبہ میں

حکیم راحت نسیم سوہدروی

معروف مسلمان سپہ سالار طارق بن زیاد کی قیادت میں اسلامی فوج نے مقاصد جلیلہ کے ساتھ شمشیر بکف ہوکر اندلس کو فتح کیا' اور شرک وکفر کو مٹا کر شمع توحید روشن کر کے ساڑھے سات سو سال سے زیادہ عرصہ تک نہ صرف حکومت کی بلکہ یورپ کی اس عظیم الشان سلطنت کو مرکز علم وحکمت بنا کر علوم وفنون میں بے پناہ ترقی کی جس کی روشنی سے یورپ منور ہوا۔ مسلمانوں کی اس ترقی پر دنیا حیرت زدہ رہ گئی اور اُس کا شہرہ یورپ ہی نہیں دنیا بھر میں ہوا۔ پورا یورپ مسلمانوں کی اس ترقی سے مرعوب تھا اور دنیا کی ہر قوم مسلمانوں سے کوسوں پیچھے تھی۔ مسلمان قوم ایک ترقی یافتہ قوم تھی' جبکہ اقوامِ عالم ترقی پذیر تھیں۔ وہ اقوامِ عالم کی امام تھی اور دنیا اس کی امامت کو تسلیم کرتی تھی۔

اُمت مسلمہ کا یہ دورِ عروج یقیناً مسرت انگیز ہے' مگر دوسرا پہلو المناک اور خونچکاں ہے کہ جب اندلس کے ان مجاہدوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ وہ عقیدۂ توحید اور امامتِ عالم کے امین ہیں تو خداوند لاشریک نے بھی انہیں فراموش کر دیا' جس کے نتیجے میں وہ تاریخِ عالم میں اس طرح فنا ہوئے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود سرزمین اندلس کا چپہ چپہ ان کی ہلاکت وبربادی اور زوال پر ماتم کناں ہے۔ اس ہلاکت اور زوال کا سبب داخلی اتحاد کی کمزوری' فرقہ واریت میں الجھنا اور شمشیر وسناں کو چھوڑ کر طاؤس ورباب کا دلدادہ ہونا تھا۔ فرڈی ننینڈ نے ۱۲۳۶ء میں (تقریباً آٹھ سو برس قبل) جب مسلمانوں کو شکست دے کر اندلس (اسپین) پر اسلامی اقتدار کا خاتمہ کیا تو مسلمانوں کو ملک بدر کر دیا۔ مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارات اور مساجد پر فاتح عیسائی راہبوں نے قبضہ جما لیا۔ اس طرح قرطبہ کی عالی شان اور پُرشکوہ مسجد جسے مسجد قرطبہ کا نام دیا جاتا ہے اور جس کی تعمیر عبدالرحمٰن اوّل نے وادی الکبیر کے کنارے ۷۵۸ء میں شروع کرائی اور اس کی توسیع دسویں صدی تک جاری رہی' اس مسجد کے

صدر دروازے پر سینٹ یاگو کے گرجا گھر کا وہ گھنٹہ لٹک رہا تھا جو عجوبہ روزگار تھا۔ اس مسجد کی تعمیر میں ملک ملک کے انجینئروں کا کمال مہارت اور بے بہا دولت صرف ہوئی تھی۔ اس مسجد میں چودہ سو منقش ستون نصب تھے۔ شاہ فلسطین نے جہاز میں ساڑھے چار سو من قیمتی پتھر بھجوائے۔ اس پر کتبے کوفی خط میں سونے کے موٹے موٹے لفظوں سے لکھے گئے۔ صدیاں گزر گئی ہیں مگر آج بھی اس کے آثار سے وہ کچھ نظر آتا ہے کہ عقل انسانی ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتی ہے۔

اندلس (اسپین) میں مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ہی دوسری مساجد کی طرح یہ مسجد بھی عیسائی راہبوں کے تسلط میں آ گئی' جنہوں نے اسے گرجا گھر (Cathedral) میں تبدیل کر دیا۔ منبر اور دیوان میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی' البتہ اذان اور نماز پر پابندی عائد کر دی گئی کہ اب یہ گرجا گھر ہے جہاں صرف عیسائی عبادت کر سکتے ہیں۔ تقریباً آٹھ صدیاں گزرنے پر علامہ اقبال کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہوا کہ انہوں نے اس پابندی کے باوجود مسجد قرطبہ میں نہ صرف اذان دی بلکہ نماز ادا کی۔ اگرچہ اس حوالے سے علامہ اقبال کی کوئی تحریری شہادت موجود نہیں ہے' تاہم تصویری ثبوت موجود ہے اور مختلف افراد نے تفصیلات بتائی ہیں' جن کے مطابق پہلی گول میز کانفرنس (۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء تا ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء) میں علامہ اقبال کو شریک نہ کیا گیا۔ دوسری گول میز کانفرنس (۷ ستمبر تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء) میں علامہ اقبال شریک ہوئے اور کانفرنس کے خاتمے پر مولانا غلام رسول مہر کے ہمراہ برطانیہ سے فلسطین چلے گئے اور مؤتمر عالم اسلامی میں الوداعی تقریر کر کے واپس ہندوستان آ گئے۔

مولانا عبدالمجید سالک کے مطابق:

''تیسری گول میز کانفرنس کا آغاز ۱۶ نومبر کو ہونا تھا۔ علامہ ۱۳/اکتوبر ۳۳ء کو لاہور سے فرنٹیئر میل پر بہ عزم یورپ روانہ ہوئے۔ مقصد یہ تھا کہ لندن پہنچنے سے پہلے ویانا' بوداپسٹ' برلن وغیرہ کے علمی مراکز میں دو چار روز قیام کرتے جائیں''۔ (ذکر اقبال' ص ۱۷۸)

''علامہ ۱۲/نومبر کو لندن پہنچے۔ تیسری گول میز کانفرنس ۱۷/نومبر کو شروع ہو کر ۱۷/دسمبر ۱۹۳۳ء کو ختم ہوگئی۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد علامہ پیرس پہنچے اور علمی حلقوں کے علاوہ برگساں سے ملاقات کی۔ اس کے بعد علامہ نے ہسپانیہ کا دورہ کیا''۔ (ذکر اقبال' ص ۱۸۰)

علامہ اقبال خود ایک اخبار کے نامہ نگار سے سفر اسپین کے بارے میں فرماتے ہیں:

''مجھے لندن میں اسپین جا کر لیکچر دینے کی دعوت ملی تھی۔ اسلام کے مرکز کو دیکھنے کا

مشتاق تھا' میں نے دعوت قبول کر لی''۔(آئینہ اقبال' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی' ص ۱۹۸)

''قرطبہ پہنچنے کے بعد آپ (علامہ) وہاں کی یگانہ روزگار مسجد میں تشریف لے گئے جو اب گرجا گھر بن چکی ہے۔ڈاکٹر اقبال نے اپنے گائیڈ سے کہا کہ میں یہاں نماز ادا کرنا چاہتا ہوں۔گائیڈ نے بتایا کہ یہ بات پادریوں کو ناگوار ہوگی اور وہ ہرگز اجازت نہ دیں گے۔اقبال اس جگہ مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئے جس کو بے حد مقدس سمجھا جاتا ہے۔اتنے میں ایک پادری آ پہنچا اور زور شور سے احتجاج کرنے لگا۔اقبال نے پادری کی طرف رخ کر کے گائیڈ سے کہا کہ ایک دفعہ مدینہ میں عیسائیوں کا وفد کوئی التماس لے کر پیغمبر اسلام کے پاس آیا۔اس کے اراکین کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا تھا۔جب ان کی عبادت کا وقت آیا تو وہ متردد تھے کہ انہیں اس کی اجازت دی جائے گی یا نہیں۔آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ یقیناً اپنے طور طریقے کے مطابق عبادت کر سکتے ہیں۔ اگر عیسائیوں کو آنحضرت ﷺ نے اپنی ہی مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دی تھی تو انہیں ایک ایسی جگہ پر نماز ادا کرنے کی اجازت کیوں نہیں جو کبھی مسجد تھی۔اقبال سے یہ سن کر اُس نے کہا کہ میں بڑے پادری سے پوچھ کر آتا ہوں۔اقبال نے پادریوں اور محکمہ آثار قدیمہ کی اجازت لے کر مسجد میں اذان دی جس کی فضا صدیوں سے بے اذان پڑی ہوئی تھی۔نماز پڑھی۔آپ کی نماز کی حالت میں ایک پادری نے تصویر بھی اتاری''۔ (ملفوظات اقبال' مرتبہ محمود نظامی' ص ۳۱۸)

مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے یہ سارا واقعہ سید امجد علی کے نام لکھ بھیجا''۔(ذکر اقبال' ص ۱۳۸)

علامہ اقبال کا یہ خط تا حال منظر عام پر نہیں آ سکا' وگرنہ علامہ کے قلم سے یہ تفصیل سامنے آ چکی ہوتی۔

مسجد قرطبہ میں علامہ اقبال کی دو تصاویر چھپ چکی ہیں جو روزگار فقیر ص ۴۸' ۴۹ پر موجود رہیں۔یہ دونوں تصاویر ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔ایک تصویر میں وہ مصلیٰ پر قعود کی حالت میں نماز ادا کرنے میں مشغول ہیں' جبکہ دوسری تصویر میں مصلیٰ پر ہاتھ میں چھڑی لیے کھڑے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نماز سے فراغت کے بعد کی ہے۔یہ تصاویر مسجد کے اس مقام پر لی گئی ہیں جو بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال نے نماز ادا کرنے کے لیے مسلمانوں کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو ذہن میں لاتے ہوئے اس جگہ کا انتخاب کیا ہوگا۔

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ نے طے شدہ پروگرام کے مطابق نماز ادا کی' اور یہ کسی اضطراری حالت کا نتیجہ نہیں' جیسا کہ ان کے بعض تذکرہ نگار یہ تأثر دیتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جس جگہ نماز ادا کی وہ مسجد قرطبہ کا دالان ہے۔ اس ہاتھ ایک محرابی راستہ ہے جو خلیفہ الحکم ثانی نے ۹۶۱ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ فن تعمیر کے حوالے سے انتہائی منفرد خصوصیات کا حامل ہے اور اس قدر اہم ہے کہ اسلامی فن تعمیر اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے تقریباً ہر کتاب میں مختلف زاویوں سے اس محراب کی تصویر reproduce کی جاتی ہے اور اس فن تعمیر کے حوالے سے اس کے محاسن بیان کیے جاتے ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کو قدیم عربی تہذیب سے نہایت دلچسپی بلکہ عشق تھا اور اسپین قدیم زمانے میں عربی تہذیب کا مرکز تھا اور آج اس کا مدفن ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں انہوں نے اسپین کا سفر کیا اور اس کی ہر چیز سے متأثر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے خالص مذہبی اور تاریخی جذبات کے زیر اثر اسپین کا سفر کیا تھا اور اس حیثیت سے وہاں کی ہر چیز پر نظر ڈالی۔ اسپین کے سفر میں ڈاکٹر صاحب کو پروفیسر آسین سے ملاقات کا موقع ملا''۔ (اقبال کامل' ص ۲۹ تا ۳۲)

علامہ اقبال نے اپنے اس سفر اسپین کے دوران اپنے فرزند جاوید اقبال کے نام دو کارڈ بھیجے جو تصویری تھے' جن پر مسجد قرطبہ کے عکس تھے۔ اس کے ساتھ ہی لکھا کہ:

''میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میں اس مسجد کو دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو''۔

علامہ اقبال اسپین کی مسجد قرطبہ سے اس قدر متأثر ہوئے کہ اسپین سے واپسی پر پیرس (فرانس) سے ایڈیٹر انقلاب کے نام اپنے خط میں تحریر کیا:

''مرنے سے قبل قرطبہ ضرور دیکھو''۔

علامہ اقبال ۲۷ مارچ ۱۹۳۳ء کو محمد اکرام کے نام اپنے خط میں سفر اسپین کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''میں اپنی سیاحت اندلس سے اس قدر لذت گیر ہوا ہوں کہ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر لکھی گئی' جو کسی وقت شائع ہوگی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کوئی زیادہ اثر

نہیں ہوا، لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی کیفیت میں پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی''۔ (اقبال نامہ، جلد دوم، ص ۳۲۱)

علامہ اقبال نے مسجد قرطبہ پر ذیل کی نظم لکھی جس سے ان کے جذبات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے:

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصلِ حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیٔ کائنات

تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رَو، جس میں نہ دن ہے نہ رات!

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات! کارِ جہاں بے ثبات!

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اُس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام!

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام!

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات!
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!

قطرۂ خونِ جگر، سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!

تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود

عرشِ معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں  گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہر کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا  اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود!
کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق  دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق مری لَے میں ہے، شوق مری نَے میں ہے
نغمۂ اللہ ہُو میرے رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل  وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پایدار، تیرے ستوں بے شمار  شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل!
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور  تیرا منارِ بلند جلوہ گہ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں، کہ ہے  اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ
اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثُغُور  اس کے سمندر کی موج، دجلہ و دنیوب و نیل!
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب  عہد کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل!
ساقیٔ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق  بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل!

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا اِلٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا اِلٰہ

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مؤمن کا راز  اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقامِ بلند، اس کا خیالِ عظیم  اس کا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مؤمن کا ہاتھ  غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات  ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل  اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو  رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں  اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبیں  تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر  قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!
آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار  حامل ''خلقِ عظیم'' صاحبِ صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب　　سلطنت اہل دل فقر ہے، شاہی نہیں!
جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب　　ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی　　خوش دل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال　　اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے!
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے!

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں　　آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے　　عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!
دیکھ چکا المنیؔ، شورشِ اصلاحِؔ دیں　　جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت　　اور ہوئی فکر کی کشتیٔ نازک رواں
چشم فرانسیسؔ بھی دیکھ چکی انقلاب　　جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر　　لذت تجدیدؔہ سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب　　راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!
دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب　　لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب!
سادہ و پُرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت　　کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب!
آبِ روانِ کبیر[1]! تیرے کنارے کوئی　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں　　میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے　　لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی　　روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب!
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم　　کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!
نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر!

(۱) وادالکبیر، قرطبہ کا مشہور دریا جس کے قریب ہی مسجد قرطبہ واقع ہے۔

# حقوقِ ہمسایہ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے۔ یہاں معاشرے کے افراد کے حقوق و فرائض کا بطریقِ احسن تعین کیا گیا ہے۔ انسان کا قریب ترین رابطہ تو اپنے ماں باپ' اولاد اور رشتہ داروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کا مستقل واسطہ اپنے ہمسایوں سے ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمسایوں میں دفتر کے ساتھی' سفر کے ساتھی' کاروبار کے ساتھی اور ہم مجلس بھی شامل ہیں' اور سبھی حسن سلوک کے مستحق ہیں' مگر حقیقی ہمسایہ تو وہ ہے جس کی جائے رہائش قریب ترین ہو۔ اس ہمسائے کے ساتھ شب و روز کا تعلق ہوتا ہے لہٰذا اس کے حقوق کی ادائیگی کا خاص طور پر خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اگر ہمسائے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات رکھتے ہوں گے تو ان کی زندگی میں امن وسکون رہے گا اور ان کو خوشگوار ماحول میں زندگی گزارنے کا موقع ملے گا۔ اس کے برعکس اگر ہمسایوں کی آپس میں مفاہمت (understanding) نہ ہو تو دونوں خاندانوں کی زندگی بے مزا اور تلخ ہو جاتی ہے۔

آپس کی زندگی خوشگوار انداز میں گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمسائے ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلقات رکھیں۔ حقوقِ ہمسایہ کے بارے میں اسلام میں اس قدر تاکید ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((مَا زَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ))[1]

''جبریل علیہ السلام پڑوسی کے حق کے بارے میں مجھے برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اس کو وارث قرار دیں گے''۔

گویا شریعت اسلامیہ میں ہمسائے کے حقوق کی اہمیت انتہائی قریبی رشتہ داروں ہی کی مانند ہے۔

ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کے متعلق قرآن وسنت کے واضح احکام موجود ہیں۔

یہاں تک کہ اگر ماں باپ فاسق وفاجر، حتیٰ کہ کافر ہوں تب بھی ان کا اکرام اور خدمت اولاد پر لازم ہے۔ اسی طرح ہمسائے کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ ہمسایہ بہرحال حسن سلوک کا مستحق ہے، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ جامع الترمذی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے ہاں بکری ذبح ہوئی، جب وہ گھر آئے تو انہوں نے گھر والوں سے پوچھا کیا تم لوگوں نے ہمارے یہودی پڑوسی کے لیے بھی گوشت کا ہدیہ بھیجا ہے؟ گویا انہوں نے گھر والوں سے پوچھ کر اطمینان کر لیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے یہودی ہونے کی وجہ سے ہدیہ سے محروم رکھا گیا ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے جن تین چیزوں کو اللہ اور رسولؐ کی محبت کا معیار قرار دیا ہے اُن میں سے ایک پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی قراد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے وضو کا استعمال شدہ پانی لے کر اپنے جسموں پر ملنے لگے۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا: ''تمہارے اس عمل کا سبب کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: ''بس اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت''۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ محبت کرے تو اسے چاہیے کہ وہ تین کام کرے:

(۱) بات کرے تو سچ بولے (۲) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو پوری دیانت داری کے ساتھ واپس لوٹائے (۳) اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا رویہ رکھے''۔(۲)

اس حدیث میں جہاں صدقِ مقال اور امانت داری کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت کے مظاہر قرار دیا گیا ہے وہاں ہمسائے کے ساتھ حسن سلوک کو بھی لازمی قرار دے کر اُس کی حد درجہ اہمیت کو واضح کر دیا گیا ہے۔

اکثر اوقات جب نبی اکرم ﷺ اخلاقی تعلیمات کا تذکرہ کرتے تو ہمسائے کے ساتھ اچھے سلوک کا بھی تاکیداً ذکر فرماتے۔ حضرت ابوشریح عدوی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے کانوں سے آپؐ کا یہ ارشاد سنا ہے جب کہ میری آنکھیں آپؐ کو دیکھ رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهٗ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ ..... وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ))[۳]

''جو کوئی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے ہمسائے کا اکرام کرے' اور جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے.....اور جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ منہ سے اچھی بات نکالے یا پھر خاموش رہے''۔

اگرچہ حسن سلوک میں تمام اخلاقی محاسن آ جاتے ہیں تاہم ہمسائے کے اِکرام کی اہمیت مزید واضح کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے چند متعین حقوق کی نشاندہی کر دی ہے' تاکہ ہمسائے ان کی رعایت کریں اور آپس میں پیار و محبت سے رہیں۔ حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((حَقُّ الْجَارِ اِنْ مَرِضَ عُدْتَهُ وَاِنْ مَاتَ شَيَّعْتَهُ وَاِنِ اسْتَقْرَضَكَ اَقْرَضْتَهُ وَاِنْ اَعْوَرَ سَتَرْتَهُ وَاِنْ اَصَابَهُ خَيْرٌ هَنَّاْتَهُ وَاِنْ اَصَابَتْهُ مُصِيْبَةٌ عَزَّيْتَهُ وَلَا تَرْفَعُ بِنَائَكَ فَوْقَ بِنَائِهِ فَتَسُدَّ عَلَيْهِ الرِّيْحَ وَلَا تُؤْذِيْهِ بِرِيْحِ قِدْرِكَ اِلَّا اَنْ تَغْرِفَ لَهُ مِنْهَا[۴]))

''پڑوسی کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کرو' اور اگر انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ (اور تدفین کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤ)' اور اگر وہ (اپنی ضرورت کے لیے) قرض مانگے تو (بشرطِ استطاعت) اس کو قرض دو' اور اگر وہ کوئی برا کام کر بیٹھے تو پردہ پوشی کرو' اور اگر اسے کوئی نعمت ملے تو اس کو مبارک باد دو' اور اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو' اور اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے' اور (جب تمہارے گھر کوئی اچھا کھانا پکے تو) تمہاری ہانڈی کی مہک اس کے لیے (اور اس کے بچوں کے لیے) باعثِ ایذا نہ ہو (یعنی اس کا اہتمام کرو کہ ہانڈی کی مہک اس کے گھر تک نہ جائے) اِلّا یہ کہ اس میں سے کچھ اس کے گھر بھی بھیج دو (اس صورت میں کھانے کی مہک اس کے گھر تک جانے میں کوئی مضائقہ نہیں)''۔

ہمسائے کے اِن حقوق میں اوّل بیمار پرسی ہے۔ ہمسایہ بیمار ہو جائے تو اس کے ہاں جا کر اس کا حال دریافت کیا جائے' اُس کے ساتھ حوصلہ بڑھانے والی باتیں کی جائیں۔ اگر اس کو دوا دارو کے ضمن میں کوئی ضرورت درپیش ہو تو اُس کی مدد کی جائے۔ مزاج پرسی خود بہت بڑا

فضیلت کا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ اکثر مزاج پرسی کے لیے تشریف لے جاتے تو مریض کا حوصلہ بڑھاتے اور یہ کہہ کر مریض کا دل خوش کرتے کہ یہ بیماری تمہارے گناہوں کو مٹا دے گی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ہمسائے کا انتقال ہو جائے تو اس کا جنازہ پڑھے' یعنی کفن دفن میں لواحقین کا ہاتھ بٹائے۔ یہ کام بھی بہت بڑے اجر وثواب کا باعث ہے' پھر ہمسائے کے معاملے میں تو اس کی تاکید بھی ہے۔ بعض اوقات ہمسائے کو کسی واقعی ضرورت کے لیے قرض لینا پڑتا ہے تو ایسی صورت میں اپنی استطاعت کے مطابق ہمسائے کی مدد کرنا لازم ہے۔ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ بشری تقاضے کے تحت اگر ہمسائے سے کوئی برا کام سرزد ہو جائے تو اس کی پردہ پوشی کی جائے۔ انسان کا نفس تو اُسے دوسرے کی برائی اچھالنے ہی کا حکم دیتا ہے' مگر اسلام نے پردہ پوشی کی تلقین کی ہے۔ ہر شخص میں کمزوریاں ہیں اور کوئی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ اُس کی خامیاں دوسروں پر ظاہر ہوں۔ بس جو دوسروں کی خامیوں کو چھپائے گا اللہ تعالیٰ اس کی خامیوں پر پردہ ڈالے گا۔ چنانچہ ہمسائے کی خامیوں اور کوتاہیوں کو چھپانے کی تاکید کی گئی ہے' یعنی کسی ایسی بات کی اطلاع پا کر ہمسائے کی خیر خواہی کرتے ہوئے اسے اچھی نصیحت تو کی جائے مگر اُس کی غلطی کو دوسرے لوگوں پر ظاہر نہ کیا جائے۔

دکھ سکھ ہر انسان کے ساتھ ہے۔ اگر ہمسائے کو کوئی خوشی میسر آئے تو اسے مبارک دے' اس کی خوشی پر خوش ہو کر اس کی خوشی کو دوبالا کرے۔ اس طرح اچھے جذبات کا اظہار محبت کو بڑھانے کا باعث ہوگا۔ اسی طرح اگر ہمسائے کو کوئی صدمہ یا تکلیف پیش آ جائے تو اس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرے' اس کے غم میں شریک ہو اور اسے سہارا دے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ اپنا گھر تعمیر کرتے وقت ہمسائے کی سہولت کا خیال رکھا جائے۔ اپنی عمارت کو اس انداز سے بلند نہ کیا جائے کہ ہمسائے کے گھر کی ہوا بند ہو جائے۔ غرض کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جو ہمسائے کے لیے اذیت اور مشکل کا باعث ہو۔ دیکھئے آپؐ نے اخیر میں یہاں تک فرما دیا کہ اگر کسی کے ہاں اچھا کھانا پکے تو کھانے کی مہک کو ہمسائے کے گھر تک پہنچنے سے روکے تاکہ وہ احساسِ محرومی کی اذیت سے دوچار نہ ہوں کہ ہمسائے کے ہاں تو پلاؤ اور بریانی کی خوشبو آ رہی ہے مگر ہمیں اتنا اچھا کھانا میسر نہیں ہے۔ ظاہر ہے اچھے کھانے کی مہک تو دیوار کے پار بھی جائے گی' تو ایسی صورت میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب کھانا پک جائے تو اُس میں سے تھوڑا سا ہمسائے کے ہاں بھی بھیج دیا جائے تاکہ وہ بھی اس اچھے کھانے میں شریک ہو جائیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمسائے کے حقوق کا معاملہ کتنا نازک اور حساس ہے کہ اُس کے حق میں معمولی سے معمولی تکلیف بھی شریعت میں گوارا نہیں۔

ہمسائے کے حقوق کی اہمیت کے پیش نظر جہاں ہمسائے کے ساتھ ہر طرح سے اچھا سلوک کرنے کی تاکید کی گئی ہے وہاں بدسلوکی کے عواقب سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر رات کو سو جائے جبکہ اس کے برابر رہنے والا اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اس آدمی کو اس کے بھوکا ہونے کی خبر بھی ہو''۔(۵)

معلوم ہوا کہ اگر ہمسائیگی میں کوئی نادار اور مفلس رہ رہا ہو تو اس کے حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے' کیونکہ اگر وہ رات کو بھوکا سو گیا تو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق انسان کا ایمان ہی آپ ﷺ پر نہ رہا' تو ایسے شخص کا انجام کیا ہوگا؟ اسی طرح آپؐ نے اس شخص کو دوزخی کہا ہے جو اپنے ہمسائے کے لیے تکلیف و اذیت کا باعث ہو' اسے پریشان اور تنگ کرتا ہو۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ))(٦)

''وہ آدمی جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں''۔

ہمسائے کے حقوق کے بارے میں کوتاہی پر اس سے زیادہ سخت الفاظ کیا ہو سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) قَالُوْا : وَمَا ذَاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((الْجَارُ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ)) قَالُوْا : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا بَوَائِقُهُ؟ قَالَ: ((شَرُّهُ))(٧)

''اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں''۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! ایسا کون شخص ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں سے مأمون نہ ہوں''۔

ویسے تو مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ کسی بھی مسلمان بھائی کا بدخواہ نہیں ہو سکتا' بلکہ وہ دوسرے مسلمانوں کا خیر خواہ' ہمدرد اور وفادار ہوتا ہے' مگر ہمسائے کے حقوق کے معاملے میں تو

اتنی تاکید کا تقاضا یہ ہے کہ ہم لوگ ہر وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ہمارا ہمسایہ ہم سے ناراض تو نہیں، بلکہ کبھی کبھی دریافت بھی کر لینا چاہیے کہ اسے کوئی شکایت تو نہیں؟ اگر کوئی شکایت ہو تو بلا تأخیر اس کا ازالہ کرنا چاہیے۔ اس طرح باہمی خوشگوار تعلقات سکون و اطمینان کا باعث ہوں گے اور آخرت کا اجر اس پر مستزاد ہوگا۔ اگر ایسا اتفاق ہو کہ کسی اکھڑ اور بدمزاج ہمسائے سے سابقہ پڑ جائے تو اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہمیشہ نرمی کا معاملہ کیا جائے اور اس کی مدد اور خیر خواہی کا کوئی موقع ضائع نہ کیا جائے۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ وہ شخص بھی ضرور اپنا رویہ بدل لے گا اور اس طرح آپ کو خوش اخلاقی کا اچھا بدلہ مل جائے گا۔

## حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب الوصاۃ بالجار۔وصحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ۔

(۲) شعب الایمان للبیہقی۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب من کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ ۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار والضیف ولزوم الصمت.....

(٤) رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

(٥) مسند بزار۔ ومعجم کبیر للطبرانی۔

(٦) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تحریم ایذاء الجار۔

(۷) مسند احمد۔

# امام اوزاعیؒ

## ۸۵ھ.....۱۵۷ھ

امام عبدالرحمٰن اوزاعی کا شمار دوسری صدی ہجری کے ممتاز ائمہ میں ہوتا ہے۔ دوسری صدی ہجری میں فقہ وحدیث کے جو مکاتب فکر پیدا ہوئے اُن میں ایک مذہب کے بانی امام اوزاعی تھے۔ امام اوزاعی کی ساری زندگی شام میں گزری۔ اس لیے ان کے مذہب کی اشاعت وترویج بھی شام ہی میں ہوئی اور شام سے یہ مسلک اندلس پہنچا۔

شام میں امام اوزاعی کا مسلک تقریباً دوصدی تک رواج پذیر رہا۔ اندلس میں امام اوزاعی کا مسلک ۱۳۲ھ میں پہنچا اور حاکم بن ہشام کے عہد (۲۵۶ھ) تک زندہ رہا۔ اس کے بعد یہ مسلک تقریباً ختم ہوگیا اور اس کی جگہ حنفی وشافعی مسالک نے لے لی۔

## ابتدائی حالات

امام اوزاعی کا نسبی تعلق یمن سے تھا' لیکن ان کا خاندان یمن سے ترک سکونت کر کے شام میں آباد ہوگیا تھا۔ امام اوزاعی ۸۵ھ میں شام کے شہر بعلبک میں پیدا ہوئے۔ والدہ نے ان کا نام عبدالعزیز رکھا۔ بعد میں امام اوزاعی نے تبدیل کر کے عبدالرحمٰن رکھ لیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ کنیت ابوعمرو تھی۔ ان کے والد کا نام بھی عمرو تھا۔ بچپن میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا' اس لیے اُن کی تعلیم وتربیت ان کی والدہ نے کی۔

امام اوزاعی کی بچپن کی زندگی بڑی کٹھن گزری۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

> ''امام اوزاعی ابھی بچے ہی تھے کہ سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا اور یہ یتیم ہوگئے۔ والدہ نے نہ جانے کن کن مصیبتوں اور تکلیفوں کے ساتھ اُن کی پرورش کی۔ اس لیے ان کی نشوونما ایک جگہ نہیں ہوئی۔ ان کی والدہ پریشانیوں کی وجہ سے شہر بہ شہر لیے پھرتی تھیں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت پیدا کر دی کہ بیروت میں قیام پذیر ہوگئیں۔''(۱)

## تعلیم واساتذہ

ان کی تعلیم کا آغاز بیروت میں ہوا۔ کچھ عرصہ بعد یمامہ تشریف لے گئے۔ وہاں امام یحییٰ بن کثیر کی مجلس درس میں شریک ہونے لگے اور اُن سے اکتسابِ فیض کیا۔ کچھ عرصہ بعد امام یحییٰ بن کثیرؒ نے انہیں مشورہ دیا کہ بصرہ جا کر امام حسن بصریؒ اور امام محمد بن سیرینؒ سے تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ آپ یمامہ سے بصرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اُس دَور میں سفر کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یمامہ اور بصرہ کے درمیان کئی سو میل کی مسافت تھی۔ امام اوزاعی کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے دنوں میں یمامہ سے بصرہ پہنچے۔ وہاں جا کر اُن کو معلوم ہوا کہ امام حسن بصری تو انتقال کر چکے ہیں اور امام محمد بن سیرین صاحبِ فراش ہیں۔

امام اوزاعی امام ابن سیرین کی خدمت میں پہنچے تو وہ بستر مرگ پر پڑے تھے۔ امام اوزاعی ان کی عیادت کے لیے جاتے رہے لیکن ان سے استفادہ نہ کر سکے۔ (۲)

امام اوزاعی نے بے شمار اساطین فن سے تعلیم حاصل کی۔ ان کے مشہور اساتذہ میں امام عطاء بن ابی رباح، قتادہ، نافع مولیٰ ابن عمر، امام زہری، محمد بن ابراہیم اور امام ربیعہ بن یزید کے نام ملتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

**ادرک خلقاً من التابعین** (۳)

''انہوں نے تابعین کی ایک کثیر تعداد کی صحبت اٹھائی۔''

## درس وافتاء

فراغتِ تعلیم کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے ساتھ فتویٰ بھی دیتے تھے۔ ۱۱۳ھ میں جب اُن کی عمر ۲۸ سال ہوئی اُن کا شمار جلیل القدر علماء میں ہوتا تھا۔ اہل شام دینی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے شاگرد ہقل بن زیاد بیان کرتے ہیں:

**افتی الاوزاعی فی سبعین الف مسئلة حدثنا واخبرنا** (۴)

''امام اوزاعی نے ۷۰ ہزار مسائل کا جواب حدیث کی روشنی میں دیا۔''

امام اوزاعی سے روایت کرنے والوں میں نامور ائمہ حدیث شامل ہیں۔ ان میں چند نام یہ ہیں:

امام مالک، امام شعبہ، امام سفیان ثوری، امام عبداللہ بن مبارک، امام یحییٰ بن سعید القطان، ہقل بن زیاد اور ابو اسحاق الفزاری وغیرہ۔(۵)

## فضل وکمال

امام اوزاعی کے علم وفضل، عدالت وثقاہت، حفظ وضبط، تقویٰ وطہارت، امانت ودیانت، ذکاوت وفطانت اور اُن کے تبحر علمی کا اعتراف ائمہ حدیث وفقہ نے کیا ہے۔

امام یحییٰ بن معین فرماتے تھے:

''ائمہ تو چار ہیں: امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام سفیان ثوری، امام اوزاعی۔''

امام عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے تھے:

''حدیث کے چار امام ہیں: امام مالک، امام سفیان ثوری، امام حماد بن زید، امام اوزاعی''(۶)

امام مالک کا قول ہے کہ:

''امام اوزاعی ان ائمہ میں شمار ہیں جن کی اقتداء کی جاسکتی ہے۔''(۷)

امام نووی امام اوزاعی کے فضل وکمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

**وقد اجمع العلماء على امامة الاوزاعي وجلالته وعلو مرتبته وكمال فضله** (۸)

''امام اوزاعی کی امامت، جلالت، شان، علو مرتبت اور فضل وکمال پر علماء کا اتفاق ہے''۔

حافظ ابن کثیر امام اوزاعی کے علم وفضل کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خلفاء، وزراء اور تجار وغیرہ کے کسی طبقہ میں بھی اُن سے زیادہ صاحب علم وفضل اور فصیح وبلیغ، متقی وپرہیزگار آدمی نہیں دیکھا گیا۔ فقہ وحدیث، سیرت ومغازی اور دوسرے اسلامی علوم میں نہ صرف اپنے اہل وطن پر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ پر اُن کی سیادت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ زبان وادب کا ذوق بھی ان میں فطری تھا۔ ان کی تقریر وتحریر دونوں نہایت فصیح وبلیغ ہوتی تھیں''۔(۹)

حافظ ذہبیؒ نے لکھا ہے:

''امام اوزاعی اپنے علم وفضل کے اعتبار سے اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے۔ اس کے علاوہ ان میں ایک اور وصف بھی تھا کہ وہ انتظامِ ملکی کی بھی صلاحیت رکھتے تھے''۔

اورفرمایا:

**وکان یصلح للخلافة**

''وہ خلیفہ بنائے جانے کے لائق تھے۔''(۱۰)

## سیرت وکردار

سیرت وکردار میں امام اوزاعی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کا نمونہ تھے۔ زہد وورع' تقویٰ وطہارت' سخاوت وفیاضی' تواضع' وعظ وتبلیغ اور حق گوئی وبیبا کی ان کے نمایاں اوصاف تھے۔ جرأت اور حق گوئی ان کی سیرت کا سب سے نمایاں وصف تھا۔ امام صاحب نے خلفاء کے سامنے جس جرأت اور بیبا کی کا ثبوت پیش کیا اس کی مثال تاریخ اسلام میں بہت کم ملے گی۔ حافظ ابن کثیر اور حافظ شمس الدین ذہبی نے ان کی حق گوئی کا ایک واقعہ اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''بنواُمیہ کی حکومت سے امام اوزاعی کو کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا' مگر وہ جس ظلم وتشدد کے ساتھ شام سے جلاوطن کیے گئے تھے' امام اوزاعی اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ عبداللہ بن علی جس نے شام سے بنواُمیہ کا خاتمہ کیا تھا' جب اُس کو بنواُمیہ کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے اُن تمام لوگوں کا صفایا کرنا شروع کر دیا جن کو اُموی حکومت سے کسی درجہ میں بھی ہمدردی تھی۔ اس سلسلہ میں امام اوزاعی کی بھی تلاش شروع ہوئی۔ یہ کئی دن سے روپوش تھے۔ آخر ایک دن امام صاحب نے سوچا کہ میں کب تک چھپتا رہوں گا۔ آخر جرأت کر کے خود عبداللہ بن علی کے دربار میں حاضر ہو گئے۔

امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ: میں جس وقت عبداللہ بن علی کے دربار میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ عبداللہ بن علی ایک تخت پر بیٹھا ہوا ہے' اس کے ہاتھ میں ایک نیزہ ہے اور اس کے اردگرد بہت سے سپاہی ننگی تلواریں لیے کھڑے ہیں۔ میں نے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ عبداللہ بن علی نے سلام کا جواب دینے کے بجائے اپنے نیزہ کو زمین پر مارتے ہوئے کہا: اوزاعی! ہم نے ان ظالموں (بنواُمیہ) سے ملک اور اس کے باشندوں کو نجات دلانے میں جو جنگ کی ہے یہ جہاد ہے کہ نہیں؟ امام اوزاعی کے لیے یہ وقت بڑا سخت تھا' مگر انہوں نے نہایت حکیمانہ جواب دیا۔ فرمایا کہ میں نے یحییٰ بن سعید کے واسطہ سے یہ حدیث نبوی سنی ہے کہ تمام اعمال کا مدار نیت پر ہے۔ ہر شخص اپنے اعمال میں جیسی نیک و بد نیت کرے گا ویسا ہی اسے اجر ملے گا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر

تمہاری نیت صرف ملک گیری کی تھی تو تم کو اس کا اجر ملے گا اور اگر اعلائے کلمۃ الحق مقصود تھا تو پھر جہاد کا ثواب ملے گا۔ یہ غیر متوقع جواب سن کر عبداللہ بن علی غصہ سے بے تاب ہو گیا اور اسی غصہ میں اپنا نیزہ زمین پر زور سے مارا اور معاً دوسرا سوال یہ کیا کہ **یا اوزاعی ما تقول فی دماء بنی امیة؟** کہ اے اوزاعی! بنی اُمیہ کے خون کے بارے میں کیا خیال ہے؟ (یعنی ان کا قتل کرنا جائز ہے یا حرام؟)'' امام اوزاعی نے اس سوال کا جواب بھی بڑی متانت سے ایک حدیث نبویؐ کے ذریعہ دیا۔ آپؒ نے فرمایا: آنحضرت ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ مسلمان کا خون کرنا تین حالتوں میں جائز ہے: (۱) قصاص میں، (۲) شادی کے بعد زنا میں۔ اور (۳) مرتد ہونے کی صورت میں۔ عبداللہ بن علی کے لیے یہ جواب بھی اس کی توقع کے خلاف تھا اور اس دفعہ پہلے سے زیادہ غصہ کا اظہار کیا۔ اور تیسرا سوال یہ کیا کہ بنوامیہ کے مال کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ یہ سوال میرے لیے پہلے دو سوالوں سے زیادہ مشکل تھا۔ تاہم میں نے جواب دیا کہ ان کے پاس جو دولت تھی اگر وہ حرام ذریعہ سے ان کے ہاتھ میں آئی تھی تو وہ تمہارے ہاتھ میں آ کر حلال نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ حلال تھی تو تم اس کو اس طریقہ سے لے سکتے ہو جس طرح اس کے لینے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ اس جواب سے عبداللہ بن علی بہت غصہ میں آ گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہ میرے قتل کا حکم دے گا۔ مگر اب اس نے مجھ سے کہا: اگر آپ کو عہدۂ قضاء پر مامور کر دیا جائے تو کیا آپ کو منظور ہو گا؟ میں نے جواب دیا: آپ کے اسلاف نے اس ذمہ داری سے مجھے سبکدوش رکھا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مجھے معاف فرمائیں۔

اس کے بعد امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن علی نے مجھے اجازت دے دی۔ میں ابھی تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ پیچھے سے عبداللہ بن علی کا قاصد میرے قریب پہنچا تو میں نے سمجھا کہ یہ میرے قتل کا پروانہ لے کر آیا ہے۔ میں فوراً اپنی سواری سے نیچے اُترا اور سوچا کہ قتل سے پہلے دو رکعت نماز ادا کر لوں۔ چنانچہ میں نے نماز شروع کر دی اور قاصد میرے قریب انتظار کرتا رہا۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو اس نے میری خدمت میں دو صد دینار کی تھیلی پیش کی اور کہا کہ یہ امیر عبداللہ بن علی نے بھیجی ہے۔ میں نے خوف کی بنا پر تھیلی لے لی اور گھر پہنچنے سے پہلے پوری رقم صدقہ کر دی''۔ (۱۱)

امام اوزاعی حق گوئی میں ضرب المثل تھے۔ خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی اپنے جبر وستم کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ تاریخ اسلام میں اس کے ظلم وستم کے کئی ایک واقعات درج ہیں۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام سفیان ثوری رحمہم اللہ اجمعین اس کے ظلم وستم کا شکار ہوئے۔ امام اوزاعی کے سامنے یہ سب واقعات تھے۔ ایک بار منصور نے امام صاحب کو خط لکھا کہ مجھے کوئی خیر خواہانہ مشورہ دیجیے۔ امام اوزاعی نے جواب میں لکھا:

''امیر المؤمنین! آپ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کا تقویٰ لازم کر لیجیے اور تواضع اختیار کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس دن بلند کرے گا جس دن ان متکبرین کو جو ناحق زمین پر پڑے رہتے ہیں، ذلیل کرائے گا۔ اور اچھی طرح غور کر لیجیے کہ آنحضرت ﷺ سے آپ کی قرابت اللہ تعالیٰ کے یہاں حق سے زیادہ آپ کو کچھ نہ دلائے گی''۔ (۱۲)

اس خط میں امام اوزاعی نے خلیفہ منصور کو تین کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے جنہوں نے اس کو حد درجہ متبد بنا دیا تھا، یعنی خوف خدا کی کمی، حکومت کا غرور، نسبی شرف۔

## اخلاق وعادات

اخلاق وعادات کے اعتبار سے امام اوزاعی بلند مرتبہ تھے۔ عبادت، زہد وورع، تقویٰ و طہارت میں ممتاز تھے۔ نماز نہایت خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے۔ کثرت سے نوافل ادا کرتے تھے۔ بہت سنجیدہ اور خاموش طبع انسان تھے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں ضرب المثل تھے۔ اُمت مسلمہ کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ بھلائی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے دست وبازو، زبان وقلم واقتدار اور مال ودولت یا اس کے علاوہ جو بھی صلاحیت عطا کی ہے، ان کو اسی راہ میں لگا دیا جائے، یہ ایمان کی سب سے بڑی علامت ہے۔ امام اوزاعی اس وصف میں صحابہ کرام اور تابعین عظام کا نمونہ تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے زبان وقلم کی جو صلاحیت عطا کی تھی اس کو انہوں نے اس مقصد میں پورے طور پر لگا دیا تھا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ:

**وکان انصح الامة** (۱۳)

''اُمت کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے۔''

اپنے ان اوصافِ جلیلہ کی وجہ سے ہر طبقہ میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حافظ ابن کثیر اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں کہ:

''امام اوزاعی شام میں اس قدر معزز و مکرم تھے کہ ان کا حکم اہل شام کی نظر میں بادشاہ وقت کے حکم سے زیادہ قابل قدر اور محترم تھا۔'' (۱۴)

## فقہی مسلک

امام اوزاعی ایک علیحدہ فقہی مسلک کے بانی تھے۔ ان کا مسلک شام میں دو صدی تک اور اندلس میں تقریباً ایک صدی تک زندہ رہا۔ جیسا کہ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

**وقد كان اهل الشام على مذهب الاوزاعي نحوا من مائتي سنة**(۱۵)

''اہل شام دو سو برس تک امام اوزاعی کے مسلک پر عامل رہے۔''

اندلس میں امام اوزاعی کا مسلک ہشام بن حکم (م ۲۵۶ھ) کے زمانہ تک زندہ رہا۔(۱۶)

تیسری صدی ہجری میں امام اوزاعی کا مسلک ختم ہو گیا۔ علامہ خضری اپنی کتاب ''**التشریع الاسلامی**'' میں لکھتے ہیں:

''اہل شام بہت دنوں تک ان کے مسلک پر عمل کرتے رہے، پھر اُن کا مسلک بنو اُمیہ کے ان لوگوں کے ذریعہ اندلس پہنچا جنہوں نے اندلس میں جا کر اپنی حکومت قائم کی۔ پھر شام میں امام شافعی کے مسلک کے آگے اور اندلس میں امام مالک کے مسلک کے سامنے یہ کمزور پڑ گیا اور یہ تیسری صدی ہجری کے نصف میں ہوا۔''(۱۷)

## تصانیف

علامہ ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں کا ذکر کیا ہے:

۱) کتاب السنن فی الفقہ۔

۲) کتاب المسائل فی الفقہ۔

ان کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب بھی ہے جو آپ نے امام ابوحنیفہ کے مسائل سیر و مغازی کے رد میں لکھی تھی جس کا جواب قاضی ابو یوسف نے ''**کتاب الرد علی سیر الاوزاعی**'' کے نام سے دیا۔

## وفات

امام اوزاعی کا انتقال ۱۵۷ھ میں ہوا۔ مہینہ صفر یا ربیع الاول کا تھا۔ ان کی وفات کا سانحہ بڑا دردناک ہے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ امام اوزاعی ایک دن غسل کرنے کے لیے ایک حمام

میں گئے۔حمام کا مالک لاعلمی میں باہر سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔اندر آگ جل رہی تھی اور باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ چنانچہ اسی حالت میں وہ جاں بحق ہو گئے۔ جب صاحب حمام واپس آیا اور اس نے دروازہ کھولا تو آپ فرش پر قبلہ رو مردہ پڑے تھے۔

امام صاحب کی وفات بیروت میں ہوئی اور تدفین بیروت کے قریب قریہ خنثوس میں ہوئی۔(۱۸)

## حواشی:

۱) البداية والنهاية، ج۱۰، ص ۱۱۵۔
۲) ایضاً۔
۳) ایضاً، ص ۱۱٦۔
٤) ایضاً۔
٥) تهذيب التهذيب، ج٦، ص ۲۳۹۔
٦) ایضاً۔
۷) البداية والنهاية، ج۱۰، ص ۱۱٦۔
۸) تهذيب الاسماء، ج۱، ص ۲۹۹۔
۹) البداية والنهاية، ج۱۰، ص ۱۱٦۔
۱۰) تذكرة الحفاظ، ج ۱، ص ۱٦۲۔
۱۱) البداية والنهاية، ج۱۰، ص ۱۱۸۔تذكرة الحفاظ، ج۱، ص ۱٦۲، ۱٦۳۔
۱۲) حسن المساعی از امیر شکیب ارسلان، ص۲۰۔
۱۳) تهذيب التهذيب، ج٦، ص ۲٥٦۔
۱٤) البداية والنهاية، ج۱۰، ص۱۲۰۔
۱٥) اختصار اعلام الحديث، ص ۹۹۔
۱٦) تهذيب التهذيب، ج٦، ص ۲٥٦۔
۱۷) التشريع الاسلامی، ص۲۷۰۔
۱۸) تاريخ ابن خلكان، ج۱، ص ٤۹۳۔

❁ ❁ ❁

# قسط وار سلسلہ (49)

# سعودی عرب

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

## سعودی عرب: ایک نظر میں

پورا نام: المملكة العربية السعودية

حکمران: شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز

رقبہ: 1,960,582 مربع کلومیٹر (756,981 مربع میل)

آبادی: دو کروڑ ساٹھ لاکھ

اوسط عمر: 75 سال

سالانہ شرح پیدائش: 2.44 فیصد

آبادی کی گنجانی: 26 فی مربع میل

دارالحکومت: ریاض

زبان: عربی

نسلیں: عرب 90 فیصد، افریقی وایشیائی 10 فیصد

مذہب: اسلام 100 فیصد

شرح خواندگی: 78 فی صد

طرزِ حکومت: بادشاہت

کل قومی پیداوار: 287 ارب ڈالر سالانہ

فی کس آمدنی: گیارہ ہزار 800 ڈالر سالانہ

افرادی قوت: 64 لاکھ

بے روزگاری: 25 فی صد سالانہ

قابل کاشت رقبہ: 1.67 فی صد

زراعت: گندم، جَو، آلو، تربوز، کھجور، مالٹا، گوشت، مرغیاں، انڈے، دودھ۔

صنعت: خام تیل، تیل کی صفائی، پیٹرو کیمیکل، سیمنٹ، تعمیرات، کھاد، پلاسٹک۔

تیل کی سالانہ پیداوار:8.712ملین بیرل روزانہ

تیل کے ذخائر:261.7ارب بلین

گیس کے ذخائر:6.340ٹرلین کیوبک میٹر

برآمدات86.53ارب ڈالر(تیل اور متعلقہ مصنوعات)

درآمدات:30.38ارب ڈالر(مشینری اور پرزہ جات۔غذا' کیمیکل' کاریں' ملبوسات)

تجارتی ساتھی:امریکا' جاپان' جنوبی کوریا'

جرمنی' برطانیہ' چین' تائیوان' فرانس۔

زرِمبادلہ کے ذخائر:22.86ارب ڈالر

بیرونی قرضہ:39.16ارب ڈالر

کرنسی:سعودی ریال

ٹیلی فون:35لاکھ

ریڈیو سٹیشن:اے ایم43۔ایف ایم31

ٹی وی سٹیشن:117

ریلوے:1392 کلومیٹر

سڑکیں:151,470 کلومیٹر

بندرگاہیں:دمام' جدہ' جازان

بحری تجارتی جہاز:66

ہوائی اڈے:104

کل فوج:ڈیڑھ لاکھ

سالانہ جنگی اخراجات:18ارب ڈالر

اخبارات کی خواندگی فی ہزار:75

کاروں کی تعداد فی ہزار:200

سعودی عرب وہ معزز و محترم ملک ہے جسے خاتم الانبیاء رسول کریم ﷺ کا مولد اور اسلام کا گہوارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔مسلمانانِ عالم کے دو مقدس ترین مقامات مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ(حرمین شریفین)اسی مملکت میں واقع ہیں۔

سعودی عرب تیرہ انتظامی صوبوں(مناطق)میں منقسم ہے:1-الباحة 2-الجوف 3-الحدود الشمالية 4-المدينة المنورة 5-القصيم 6-الرياض 7-المنطقة الشرقية 8-عسير 9-حائل 10-جازان 11- مكة المكرمة 12- نجران 13-تبوك۔لق ودق ریگستان اور خانہ بدوش لوگوں کے سبب سعودی عرب کی شمالی اور مشرقی سرحدیں بہت واضح طور پر متعین نہیں' جس کے سبب پڑوسی ملکوں سے تنازعہ رہتا ہے۔تیل کا پتا لگنے کے بعد سرحدوں کے تعین کا مسئلہ اور بھی اہم ہو گیا ہے۔

ارضی ساخت اورٹوپوگرافی کے اعتبار سے سعودی عرب میں زبردست تنوع پایا جاتا ہے۔بحیرۂ قلزم کے متوازی مشرق میں ساحلی میدان ہیں۔اس ساحلی میدان کے مشرق میں شمال سے جنوب تک پہاڑی سلسلہ ہے۔اس پہاڑی سلسلے کو حجاز بھی کہتے ہیں۔حجاز کے معنی روک یا رکاوٹ کے ہیں۔واقعتاً ملک کے مغربی حصے میں یہ پہاڑی سلسلہ ایک دیوار کے مانند ہے جو مغرب کے ساحلی میدان کو سعودی عرب کے دوسرے حصوں سے جدا کرتا ہے۔جدہ اور مکہ کے پاس اس پہاڑی سلسلے کی اونچائی بہت کم ہے' لیکن مکہ شہر کے جنوب میں بعض چوٹیوں کی بلندی سطح سمندر سے 2650 میٹر تک' جبکہ طائف میں جبل سودا کی اونچائی سطح سمندر سے 2850 میٹر ہے۔

سعودی عرب کے عین وسط سے خط سرطان گزرتا ہے جس پر جون کے مہینے میں سورج کی کرنیں عمودی پڑتی ہیں۔مجموعی طور پر سعودی عرب کی آب وہوا برّ اعظمی گرم ریگستانی ہے۔تاہم مختلف علاقوں میں ساحل سے دوری اور سطح سمندر سے اونچائی کا اثر درجۂ حرارت پر گہرا پڑتا ہے۔ساحل سمندر سے اندرونی علاقوں کی طرف جاتے ہوئے یومیہ اور سالانہ درجۂ حرارت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

حجاز اور حضر الموت کے علاقوں میں نسبتاً زیادہ بارش ہوتی ہے۔ان علاقوں میں برگ ریز جنگل اور کانٹے دار جھاڑیاں پائی جاتی ہیں۔1100 میٹر کی بلندی پر برگ ریز درختوں کی جگہ چیڑ کے درخت پائے جاتے ہیں۔ارضیاتی ساخت میں تنوع اور مختلف ارضیاتی ادوار میں بننے والی آتشی' متغیرہ اور پرت دار چٹانوں میں بہت سے معدنی ذخائر موجود ہیں۔ابھی تک ملک کی پوری طرح ارضیاتی پیمائش (جیالوجیکل سروے) نہیں ہوئی ہے۔

سعودی عرب پٹرولیم کے معاملے میں دنیا کے امیر ترین ملکوں میں سے ایک ہے۔1940ء کے آس پاس حساصوبے میں پٹرولیم کے ذخائر ملے تھے۔جبل فہد کی مغربی ڈھلانوں پر 1964ء میں تیل کے بھاری ذخائر دریافت ہوئے تھے۔غوار (مشرقی سعودی عرب) کے علاقے میں تقریباً 250 کلومیٹر کی لمبائی تک پٹرولیم کے ذخائر پھیلے ہوئے ہیں جو دنیا کے سب سے بڑے ذخائر میں سے ایک ہیں۔پٹرولیم اور قدرتی گیس ملک کے سب سے اہم ذخائر ہیں۔علاوہ ازیں سونا' چاندی' جست' سیسہ' تانبا وغیرہ وافر مقدار میں موجود ہیں۔

سعودی عرب کا بہت ہی کم رقبہ قابل کاشت ہے۔چالیس فی صد رقبے پر چراگاہیں پھیلی ہوئی ہیں۔تقریباً نصف فی صد رقبے پر جنگلات ہیں اور باقی 59 فیصد بنجر' پہاڑی اور ریگستانی ہے۔ملک میں کھیتی باڑی صرف نخلستانوں تک محدود ہے۔پانی کی کمی کے باعث ملک کے کسی بھی علاقے میں بڑے پیمانے پر فصل خیزی نہیں ہوسکتی۔پھر بھی حکومت نے الخرج کے نخلستانوں کے کنوؤں سے نہروں کے ذریعے آس پاس کے ریگستانوں کو سیراب کرنے کا بندوبست کیا ہے۔اس طرح سیراب ہونے والے علاقوں میں گیہوں' جو' مکئی' الفافا (برسیم' چارہ) گنا' کھجور اور سبزیوں کی کاشت کی جاتی ہے۔سیراب ہونے والی زمینوں میں شور اور کھاری پانی سے بہت سا رقبہ بے کار ہوجاتا ہے۔کنوؤں سے زیادہ پانی نکالنے کے سبب زیر زمین آبی سطح بھی نیچے ہو رہی ہے۔

## مختصر حالیہ تاریخ

1517ء خلافتِ عثمانیہ نے اس خطے پر اپنا اقتدار قائم کیا۔

1745ء محمد بن عبدالوہاب نے عقائد واعمال کی تطہیر واصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور دیکھتے دیکھتے وہابی تحریک پورے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی۔

1818ء عثمانیوں نے اپنے حلیف مصریوں کو ساتھ ملا کر وہابیوں کو اقتدار سے محروم کیا اور وہابی تحریک کو ضعف پہنچایا۔اس سے پہلے 1811ء میں وہابی تحریک کو مصر کے فوجی دستے نے محمد علی کی قیادت میں کچل دیا تھا۔کچھ عرصے کے لیے تحریک پھر اُبھرتی ہے' لیکن 1818ء میں اُسے پھر کچل دیا جاتا ہے۔

1902ء تا 1932ء۔جلاوطن وہابی لیڈر ابن سعود خلافتِ عثمانیہ کے زیر اقتدار علاقوں احساء' حجاز اور عسیر کے علاقوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ''سعودی عرب'' کی نئی مملکت قائم کرتے ہیں۔

1936ء خلیج فارس کے قریب تیل دریافت ہوا۔

1953ء شاہ عبدالعزیز بن سعود کا انتقال۔ان کی جگہ سعود بن عبدالعزیز تخت نشین ہوتے ہیں۔

1962ء یمن میں مصر کے صدر جمال عبدالناصر کی حمایت میں بغاوت ہوتی ہے۔امام یمن کو معزول کر دیا جاتا ہے۔اس موقع پر سعودی عرب کی شاہی افواج یمن بھیجی جاتی ہیں۔مصر سے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔

1964ء شاہ سعود بن عبدالعزیز معزول کر دیے گئے۔ان کی جگہ ان کے بھائی شاہ فیصل مامور ہوئے۔شاہ فیصل غلامی کا خاتمہ کرتے ہیں۔سرکاری اداروں کی ازسرنو تنظیم کرتے ہیں۔مصر سے دوبارہ سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔

1967ء عرب اسرائیل کی چھ روزہ جنگ کے دوران میں سعودی عرب اپنی فوجیں اردن روانہ کرتا ہے' لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔جنوبی یمن میں روس اور شام کی مداخلت کے خلاف وہاں کے شاہ پسندوں کو فوجی امداد دی جاتی ہے۔

1969ء حکومت کے خلاف ناکام بغاوت ہوتی ہے۔سینکڑوں افراد گرفتار ہو جاتے ہیں۔

1970ء یمن کو مالی امداد دی جاتی ہے۔

1973ء عرب اسرائیل جنگِ رمضان کے دوران شاہ فیصل امریکہ کو تیل کی فراہمی میں دس فی صد کمی کر دیتے ہیں۔

1975ء شاہ فیصل کو اُن کا بھتیجا شہزادہ فیصل قتل کر دیتا ہے۔ولی عہد شہزادہ خالد بن عبدالعزیز تخت نشین ہوتے ہیں۔

1976ء تیل کی قیمتوں میں پانچ فیصد اضافہ کیا جاتا ہے۔

1978ء سعودی عرب امریکہ سے پچاس ''ایف پندرہ'' لڑاکا طیارے خریدتا ہے۔

1979ء بعض دہشت گرد مکہ معظّمہ میں خانۂ کعبہ پر دو ہفتوں تک قابض رہتے ہیں۔سعودی عرب کی فوج انہیں مار بھگاتی ہے۔

1981ء سعودی عرب امریکہ سے پانچ اواکس طیارے خریدتا ہے۔

1982ء شاہ خالد بن عبدالعزیز وفات پاتے ہیں۔ان کی جگہ ولی عہد فہد بن عبدالعزیز تخت نشین ہوتے ہیں۔

1996ء شاہ فہد بن عبدالعزیز نے علالت کے باعث اور آرام کی غرض سے اقتدار ولی عہد شہزادہ عبداللہ کے سپرد کر دیا۔

1998ء تیل کی فروخت سے ہونے والی آمدنی میں 40 فیصد کمی ہوئی' کیونکہ عالمی مارکیٹ میں تیل کی قیمتیں گر گئیں۔

2000ء سعودی عرب دوسرے تیل برآمد کرنے والے عرب ممالک (اوپیک) کے ہمراہ تیل کی قیمتیں گھٹانے پر مجبور ہو گیا۔ستمبر میں قیمت 35 ڈالر فی بیرل ہو گئی۔ستر کی دہائی میں تیل کی جتنی زیادہ مقدار برآمد ہوئی تھی' اس کے تناسب سے برآمد بہت کم ہو گئی۔

2001ء امریکہ نے افغانستان اور عراق پر حملے کیے تو سعودی حکومت نے ملک بھر میں امریکیوں کو فوجی اڈے محدود تعداد میں استعمال کرنے دیے۔اس کے باوجود 11/ ستمبر کو ٹریڈ سنٹر کے انہدام کے واقعے کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی رہی۔

2002ء مارچ میں ولی عہد شہزادہ عبداللہ نے عرب سربراہوں کی کانفرنس میں' مشرق وسطیٰ اور اسرائیل کے تنازعے کے حل کے لیے ایک امن فارمولا پیش کیا۔یعنی اگر اسرائیل تمام عرب مقبوضات سے دست بردار ہو جائے اور آزاد فلسطین کے قیام کو تسلیم کر لے جس کا دارالحکومت یروشلم ہو تو تمام عرب ممالک اسرائیل کو تسلیم کر لیں گے' لیکن اسرائیل نے سعودی عرب کی اس فراخ دلانہ سکیم کو بھی تسلیم نہ کیا۔

2003ء اگست میں امریکہ نے سعودی عرب سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔سعودی عرب اور امریکہ کے تعلقات اسامہ بن لادن اور القاعدہ کے مسئلے پر خراب ہو گئے تھے' اب دوبارہ بحال ہو گئے ہیں۔

2005ء یکم اگست کو شاہ فہد بن عبدالعزیز کی وفات پر ولی عہد شہزادہ عبداللہ بادشاہ کی حیثیت سے تخت نشین ہو گئے۔